1499

انشائے بیخبر

ناشر
رائے صاحب
پنڈت برج ناتھ شرما

مرتبہ
انتظام اللہ شہابی

انشائی تحریر

از

انتظام اللہ شہابی

باہتمام منشی خلیل الرحمٰن خاں

مرتضائی پریس آگرہ میں چھپی

فہرست مضامین

مقدمہ

صحیفۂ انشائے بیخبر

۱۳۵۹ھ

اردو زبان اٹھارویں صدی سے پہلے عام بول چال میں داخل ہوگئی تھی۔ تمام علوم وفنون کی کتابیں اردو میں تصنیف ہو رہی تھیں، اردو شاعری آئینہ کمال پر چڑھ رہی تھی، لیکن "عالم لسانیات" کا دلچسپ نظریہ ہے کہ باوجود ان سب باتوں کے، وہی عالم، وہی مصنف، وہی شاعر اپنے مکتوبات اور مراسلات اردو میں نہیں بلکہ فارسی میں لکھتے تھے، یہ بات بظاہر عجیب نظر آتی ہے، لیکن ماہر لسانیات جانتا ہے کہ ارتقائے زبان کی رفتار یہی ہوتی ہے۔ دیکھئے انگلستان میں انگریزی زبان سے پہلے لاطینی زبان (لیٹن) جاری تھی۔ اس کے بعد انگریزی زبان کی ساخت ہوئی اور رواج ہونا شروع ہوا، لیکن مدتوں یہ رواج زبانی جمع خرچ یعنی بول چال تک رہا۔ پندرہویں صدی تک انگلستان کا تمام لٹریچر لاطینی زبان میں مرتب ہوتا رہا۔ اور خطوط نویسی بھی اسی زبان میں ہوتی رہی۔ پندرہویں صدی میں مشاہیر ادب نے انگریزی مکتوب نگاری کا سلسلہ

شروع کیا۔ سنہ ۱۸۲۲ء سے پہلے ممتاز اہل قلم کے خطوط نہیں ملتے۔

یہی حال اُردو زبان کے مکاتیب کا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک اُردو خطوط کی یادگار نہیں پائی جاتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب کسی ملک و قوم میں کوئی مکمل علمی زبان پہلے سے شائع و رائج ہوتی ہے، اور اس کے بعد ملکی ضروریات و مصالح کے زیر اثر کوئی نئی زبان بننے اور پھیلنے لگتی ہے، تو اُس وقت وہ اہل ملک و اہل زبان دو طرح کی کشمکش میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف پہلی زبان کی عادت و اُلفت اور اس میں تحریر کی آسانی گریباں گیر ہوتی ہے، اور دوسری طرف نئی زبان کی جانب سے بدگمانی ہوتی ہے۔ یعنی اس کے نامکمل ہونے کا خیال، اس کے عامیانہ و سوقیانہ ہونے کا احساس، اور اس کے اختیار کرنے میں اپنی کسر شان کا توہم مانع آتا ہے۔

چنانچہ پوری اٹھارویں صدی میں اور اُنیسویں صدی کے نصف اول میں شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی اور اُن کا خاندان، فضلی و تحسین، میر امن دہلوی اور مصنفین فورٹ ولیم انشا و قتیل، میر و سودا، شیفتہ و صہبائی وغیرہ سب کی بول چال اُردو زبان تھی، اور سب اُردو کے مصنف ہیں، لیکن کسی کے اُردو خطوط کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو تحریر بھی کسی ضرورت سے لکھتے ہیں اور گویا زبان کی آزمائش کرتے ہیں اور اس کو علمی و ادبی تصانیف کا اہل نہیں سمجھتے۔ میر تقی و میر حسن کے تذکرے، شیفتہ کا گلشن بیخار، رنگین کی مجالس، مصحفی کا تذکرہ — اُردو شاعری کے متعلق تصانیف ہیں، لیکن سب فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں خطوط نویسی تو بڑی تکلفی

کی چیز ہے نصف ملاقات کا لطف رکھتی ہے علمی و ادبی کتابوں سے پہلے اور زیادہ اُردو کے خطوط لکھنے چاہئیں تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ اُردو خطوط میں فارسی خط کی سی بے تکلفی محسوس نہ کرتے تھے، یا اظہار حال کے لئے اُردو کو کافی یا آسان نہ سمجھتے تھے۔

بہر حال یہ تذبذب یا بدگمانی کبھی ختم ہونی تھی۔ اُردو زبان تو علمی تصانیف کے لئے بھی تیار تھی خطوط نویسی کون سا بڑا کام تھا۔ اہل قلم کی توجہ درکار تھی۔ وہ انیسویں صدی میں مکتوبات اُردو کو نصیب ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو خطوط کی دلکشی اور بے تکلفی کا سہرا غالب کے سر ہے، لیکن غالب اس کے موجد نہیں ہیں، مدجد و زمانۂ ایجاد کا صحیح تعین دشوار ہے۔ لیکن قیاس ہے کہ ممتاز مکتوب نگاروں میں جن کو متقدمین کہا جا سکتا ہے وہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مرزا غالب، اور خواجہ غلام غوث بیخبر ہیں۔ بلکہ خواجہ صاحب کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے اُردو خطوط نویسی ۱۸۴۶ء میں شروع کی ہے، جبکہ مرزا غالب کا کوئی خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ہے۔

خطوط کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذاتی جن کا تعلق معاملات شخصی سے ہو۔ دوسرے علمی و ادبی وغیرہ جن میں کوئی مسئلہ علم و فن بیان کیا جائے۔ مرزا غالب جنہوں نے سب سے پہلے نہ سہی تو سب سے زیادہ اور سب سے بہتر خط لکھے ہیں۔ دونوں قسموں کے خطوط لکھتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان میں آج تک انفرادی نشان باقی ہے۔ خواجہ غلام غوث صاحب بیخبر نے بھی دونوں طرح کے خطوط لکھے ہیں جن کا ایک

مجموعہ فغانِ بےخبر کے نام سے ۱۸۹۱ء میں شایع ہوا تھا، یعنی خواجہ صاحب کی زندگی میں۔ اور دوسرا مجموعہ رشکِ لعل و گوہر اُن کے بعد ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا۔ خواجہ صاحب کے خطوط میں مکتوب نگاری کے تمام محاسن پائے جاتے ہیں۔ جو خطوط قدیم رنگ میں لکھے ہیں ان میں وہی متقدمین کی عبارت آرائی موجود ہے اور اس فن خاص میں اپنا ایک مرتبہ رکھتی ہے۔ جدید وضع کے مکتوبات میں القاب و آداب کی سادگی، اندازِ تحریر کی بے تکلفی، مکالمہ کی شان، سب کچھ موجود ہے۔ انتخاب خطوط ناظرین کے سامنے ہے۔ میں صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

مولوی محمد حامد صاحب کے خط کا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں:-

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است

ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

"اس وقت آپ کے اشتیاق نامے نے مجھے سخت متحیر کیا۔ اللہ اکبر! یہ اشتیاق کہ ایک عرصہ سے اس کا ہونا اظہار کیا جاتا ہے، اور یہ گریز کہ ایک شہر میں رہ کر ملنا تو درکنار، یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا حال مجھ پر ظاہر ہو۔ خدا خدا کیجئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے، آیئے اور ملئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپکا اشتیاق سچا نہیں۔"

اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"ہاں صاحب، آپ نے یہ القاب "ہادی مراحل خداشناسی، جامع

علوم ظاہری و باطنی" مجھے کیسے لکھا؟ مجھے اس القاب سے کیا مناسبت؟
میری صورت، میری وضع، میری معاشرت، میری حالت، سب
اس کے خلاف۔ خدا شناسی اسی کا نام ہے، جو میرا حال ہو، تو بقول
حضرت مولوی معنوی "گر ولی این است لعنت بر ولی"

مولوی محمد حامد صاحب نے اپنے خط میں خواجہ صاحب سے اُستاد ذوق کے ایک شعر کے معنی دریافت کئے ہیں خواجہ صاحب اسی جواب میں اس شعر کی تشریح لکھتے ہیں۔ اوپر کے اقتباسات اولین و آخرین کے درمیان میں اسی شعر کی طویل تفصیل ہے اور پڑھنے کے قابل ہو۔ خواجہ صاحب کا حسن بیان اور خوبی توضیح بھی قابل دید ہے اور مولوی محمد حامد صاحب کو جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ بھی باعث لطف ہے۔

کرمی مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی صدیقی نے اس مجموعہ کو مرتب کرکے خواجہ صاحب کا نام زندہ کر دیا اور ایک ادبی یادگار قائم کردی۔ مفتی صاحب علم و ادب سے خاص شیفتگی اور بزرگوں کے کارناموں کے ساتھ کمال شغف رکھتے ہیں۔ آگرہ کے خاموش کام کرنے والوں میں مفتی صاحب کا خاص مرتبہ ہے۔ ان کے پاس قلمی و مطبوعہ نادر و نایاب کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے، اور مفتی صاحب کی یہ کمال دریا دلی ہے کہ اپنی کتابیں لوگوں کو بیدریغ مستعار دیدیتے ہیں اور خود قلمی اعانت کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

۳ر جولائی سنہ ۱۹۴۰ء } (مولینا مولوی) حامد حسن قادری۔ پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

بیخبر

نام ونسب | خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث بیخبر خواجہ حضور اللہ بن خواجہ خیرالدین کشمیری کے فرزند ارجمند تھے۔ جن کا سلسلہ نسب سلطان زین العابدین والئے کشمیر تک پہنچتا ہے اور ننہیالی سلسلہ خواجہ داؤد خاکی کشمیری تک منتہی ہوتا ہے۔

آہ دلدوز مرتبہ خواجہ حسین الدین صفحہ ۱۱ پر تحریر ہے۔

خواجہ بابا داؤد خاکی منجملہ صوفیان کرام واولیائے
عظام ومقتدائے زمانہ ودر علم وفضل یگانہ بودند

بیخبر صاحب کے اجداد میں سے اکثر سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں عہدۂ قضاۃ پر مامور رہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے وقت میں یہ جگہ تخفیف میں آ گئی حضرت بیخبر کے دادا نے سونے کی تجارت شروع کی اور اسی سلسلہ سے مع

---

۵۱ خمخانۂ جاوید حصہ اول ۵۲ آہ دلدوز ۵۳ سیر المتقین

اہل وعیال لاسہ (تبت) اور پھر نیپال پہونچے جہاں کے والی نے اس بزرگ خاندان کا بڑا احترام کیا۔

تا قیام آنجا از سرکار نیپال نیز کمال اعزاز
مرعی بود[1]

خواجہ حضور اللہ نے اپنے ہی خاندان میں خواجہ فرید الدین کی دختر نیک اختر سے شادی کی جن کے بطن سے ۱۲۴۱ھ میں تنجیر پیدا ہوئے۔ چار برس کے بعد ان کے والد اور نانا نے ترک سکونت کر دی۔ ہندوستان آئے اور بنارس میں آباد ہوئے۔ یہیں تنجیر سن شعور کو پہنچے اور علمائے زماں، و فضلائے دہر سے علوم عربی و فارسی کی تکمیل کی۔

سوانحات

تنجیر کے خالو خان بہادر سید محمد خاں لفٹنٹ گورنر صوبہ شمالی ومغربی کے میر منشی تھے ان کے نائب ۱۸۴۳ء میں مقرر ہوئے اسی سلسلہ سے آگرہ آئے اور اقامت پذیر ہوئے۔ جب لارڈ الن برا نے گوالیار پر چڑھائی کی تو گورنر جنرل کے منشی خانہ میں منسلک ہو کر شریک مہم ہوئے بعد خاتمہ جنگ بہ صلہ کارگزاری خلعت پایا اسی اثنا میں خان بہادر سید محمد خاں کے پنشن لینے پر تنجیر اس عہدہ پر مقرر ہوئے۔

۱۸۴۵ء میں ان کی شادی مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی کی

---

[1] او دلبار وز

صدر کی صاحبزادی سے ہوئی۔[51]

غدر ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانہ میں قابل قدر خدمات انجام دیں، صد ہا بیکسوں کی جانیں بچائیں اور طرۂ وفاداری بھی حاصل کیا جس کے صلہ میں سرکار سے سند و خلعت ہفت پارچہ عطا ہوئی۔ ان میں تین جواہرات بھی تھے۔ جب ملکہ وکٹوریہ نے شہنشاہی کا لقب اختیار کیا تو لارڈ لٹن نے دربار کے موقع پر ان کو قیصری تمغہ مرحمت کیا۔[52] ۴۴ سال تک میر منشی کے فرائض انجام دے کر ۱۸۸۵ء میں باصرار خود پنشن لی۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے یہ اعزاز دیا کہ پنشن لینے کے لئے عدالت کی حاضری سے معافی عطا کی اور سرکار عالیہ سے "خان بہادر ذوالقدر" کا اعلیٰ خطاب ملا۔ بعد پنشن نواب کلب علی خاں والئ رامپور نے اپنے یہاں مدار المہام بنانے کی بارہا سعی کی مگر حضرت بیخبر نے ہمیشہ شکریہ کے ساتھ اس اعزاز کو نامنظور کیا۔[53]

ذوقِ علم میر منشی کے عہدہ کے انہماک کے باوجود جناب بیخبر علمی شغف کے ساتھ ادبی ذوق رکھتے تھے اور روانئ طبیعت رکے نہ رکتی تھی۔ مرزا بیدل کا رنگ فارسی پسند خاطر تھا۔ نظم و نثر دونوں میں درجہ امتیاز حاصل کیا اور اہل زبان سے اپنے کلام معجز بیان کی کما حقہ داد لی۔ چنانچہ عارف علی شاہ۔ صافی شاہ

---

[51] تاریخ خاندان مفتیان گوپامئو [52] زرشک لعل گوہر صفحہ ۶

[53] خمخانہ جاوید حصہ اول

حاذق ـ سنجر ـ توکل ـ تبلی کوچک وغیرہم جو کہ ہندوستان آئے اُنہوں نے ان کی زبان اور شاعری کا اعتراف کیا[51] ہے ـ مرزا غالب سا ہمہ دان آپ کی ان الفاظ میں مدح کرتا ہے ـ

رام پور میں ہی تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں ـ جدت طرز اس کا نام ہے ـ جو ڈھنگ تازہ تو ایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے ـ خدا تم کو سلامت رکھے[52]

حضرت سنجر نے قصیدہ خوانی و مدح سرائی کو ہمیشہ باعث ننگ و عار جانا معاصرین ذرا ذرا سے توسل اور رسوخ پر قصیدہ کا طومار کر دیتے تھے ـ لیکن اُنھوں نے باوجود تقرب جناب لفٹنٹ گورنر ایک قصیدہ و قطعہ تو کیا ایک مصرع تک کسی کی شان میں نہ لکھا اور نعتیہ اشعار پر بس کی ـ

نثر اُردو

اس زمانہ میں مقفی اور مسجع عبارت کا دستور تھا سب سے پہلے جناب سنجر ہی نے اپنی تحریرات کے ذریعہ طرز جدید کی بنیاد ڈالی سنہ ۱۸۴۶ء سے اُردو خط و کتابت کو رواج دیا[53] ـ خود مرزا غالب نے سنہ ۱۸۵۰ء سے اُردو میں لکھنا شروع کیا تھا ـ سنجر کی نثر کے متعلق مسٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں[54] :ـ

---

۵۱ رشک لعل گوہر صفحہ ۱ ۵۲ اُردوئے معلی صفحہ ۲۳۴

۵۳ داستان تاریخ اُردو مرتبہ مولانا حامد حسن قادری سہوانی ۵۴ تاریخ ادب اُردو

خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے ۔ مگر تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ تھا، جو مروج تھا۔

اخلاق اخلاق مجسم و پیکر علم و ادب تھے ۔ طبیعت میں حد درجہ کی نفاست تھی ۔ دولت و امارت کے گہوارہ میں آنکھ کھولی ۔ علم و فضل کے سایہ میں پرورش پائی ۔ حسنِ اخلاق بزرگوں سے ورثہ میں ملا یہ اسی تواضع و متانت کا اثر تھا کہ دولت کدہ پر ارباب عقل و دانش کا شب و روز مجمع رہتا ۔ شعر و شاعری کے وہ چرچے ہوتے کہ باید و شاید ۔ الہ آباد میں کچھ لوگ اب بھی ان مجالس کے دیکھنے والے موجود ہیں ۔ افسوس وہ محفلیں تو کبھی کی مفقود ہو چکیں اور اب ان کے دیکھنے والے بھی چراغ سحری ہیں ۔

صحبت احباب مرزا محمد عسکری لکھنوی "ادبی خطوط غالب" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب سے اور والد مرحوم سے بہت ارتباط و اتحاد تھا ۔ وہ جب الہ آباد جاتے تو خواجہ صاحب ہی کے دولت کدے پر ٹھہرتے تھے میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا ۔ سب سے پہلے ۱۸۸۴ء میں خود انہیں کے دولت خانہ پر خواجہ صاحب کی زیارت مجھ کو نصیب ہوئی ۔ اس زمانہ میں حضرت نیچر سبزی منڈی میں ایک وسیع مکان میں قیام فرماتے تھے ۔ باہر کے مکان میں بعض اعزا بطور دوام کے اقامت گزیں تھے ۔ گرمی کا موسم تھا خواجہ صاحب

لے اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۴

سہ پہر کے وقت نماز عصر سے فراغت کر کے باہر تشریف لاتے تھے ۔ میں نے ایسی پابندی وقت اور پابندی وضع کسی دوسرے ہندوستانی شخص میں نہیں دیکھی ۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو کر کرسیاں مونڈھے دو رویہ بچھا دیئے جاتے تھے ۔ صدر میں ایک اونچی کرسی سامنے ایک چھوٹی سی میز جس پر خاصدان وغیرہ رکھا جاتا تھا اور ہر اُدھر دو بڑے اگالدان جناب مرحوم پابندی وقت کے ساتھ ہاتھ میں تسبیح لئے محل سرا سے برآمد ہوتے اور اسی صدر کی کرسی پر متمکن ہو جاتے ۔ دونوں طرف کرسیوں اور مونڈھوں پر لوگ اپنے اپنے مرتبہ اور نیز باعتبار اس درجہ ارتباط اور دوستی کے جو خواجہ صاحب کے ساتھ ان کو حاصل تھا اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی شخص جو ایک مرتبہ کرسی پر بیٹھا ہو وہ دوسرے دن مونڈھے پر بیٹھے یا برعکس اس کے مونڈھے پر بیٹھنے والا کبھی کرسی نشینی کی جرأت کر سکے ۔ خواجہ صاحب بہت کثیر الاحباب اور خلیق اور ملنسار تھے ۔ لوگ دور دور تک سے یکہ اور گاڑی پر سوار ہو کر روزانہ ملنے آتے اور اس کو اپنی وضعداری سمجھتے تھے ۔ کبھی بڑے بڑے معزز اور باثر حضرات الہ آباد میں وارد ہوتے تو خواجہ صاحب کی ملاقات اور زیارت اپنی سعادت سمجھ کر ان سے ملنے آتے مگر ان باتوں پر میں نے غور کیا ایک یہ کہ خلاف وقت کسی سے نہیں ملتے ۔ اور اپنی جگہ کو کسی بڑے سے بڑے آدمی کے واسطے بھی نہیں چھوڑتے تھے ۔ اور لوگ

اس کا بُرا بھی نہیں مانتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے نواب محسن الملک بہادر تشریف لائے اور باوجود بزرگی سن اور بزرگی مرتبہ کے خواجہ صاحب سے نہایت خوردانہ طریقہ پر بہت جھک کر بغل گیر ہوئے اور پاس بیٹھ گئے۔

مولوی ذکاء اللہ خاں مرحوم سُنا گیا ہے کہ اپنے قیام الہ آباد کے زمانہ میں روزانہ ملنے آتے تھے۔ خواجہ صاحب باوجود کبرسن کے توانا اور تندرست اور نہایت خوش خوراک، خوش پوشاک اور باسلیقہ آدمی تھے۔ خضاب کا لگانا ۱۸۷۰ء سے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اتوار کے دن احباب کا مجمع آٹھ نو بجے سے ہوتا تھا۔ اور اس دن سب لوگ خواجہ صاحب ہی کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بعد فراغ طعام شعر و سخن کی محفل گرم ہوتی اور لطائف و ظرائف اور خوش گپیوں میں وقت صرف ہوتا تھا۔"

مولوی خوب اللہ صاحب برادر خورد مولینا محمد فاخر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں اپنے چچا صاحب کو بلانے خواجہ صاحب کے دربار میں گیا۔ پہلے پہل گیا تھا۔ میری عمر ۱۲ برس کی تھی وہاں عجب نقشہ تھا۔ تخت بچھے ہوئے اس پر دری اور اوپر سفید چاندنی اور چاروں طرف قالین اور گاؤ تکیہ لگے ہوئے۔ ایک جانب مسند بچھی جس پر خواجہ صاحب رونق افروز ان کے احباب اپنی اپنی حفظ مراتب سے بیٹھے ہوئے ایک گوشہ میں ایک عورت پاندان لئے ہوئے بیٹھی تھی بڑے بڑے اگالدان قرینہ سے رکھے ہوئے۔

ٹک اور پیچوان چل رہا تھا۔ میں سامنے کھڑا ہوا۔ خواجہ صاحب نے آنکھ اُٹھاکر دیکھا اور پوچھا میاں تم کون ہو؟ میں نے اپنا نام بتایا اور اپنے والد کا نام لیا آپ نے اپنے قریب بُلاکر پہلے گلے سے لگایا اور خادم کو اشارہ کیا وہ پانچ منٹ میں ایک خوان لایا جس میں مٹھائی اور ایک تشتری میں دو روپیہ رکھے ہوئے تھے حضرت نے خادم کو حکم دیا میاں خوب اللہ کے سامنے رکھ دو۔ چچا صاحب نے مجھ سے ارشاد کیا میاں، خواجہ صاحب کا تبرک ہے چکھ لو اور روپیہ جیب میں رکھو اور سلام کرو۔ میں نے روپیہ اُٹھاکر چومے اور آنکھوں سے لگاکر جیب میں رکھ لئے۔ اور ذرا سی مٹھائی چکھی اور ہاتھ اُٹھا لیا۔ خواجہ صاحب نے خادم سے کہا یہ خوان دائرہ شاہ اجمل پہنچا آؤ۔ غرض کہ میں دو مرتبہ تسلیمات عرض کرکے پیچھے لوٹا اور مکان چلا آیا۔ میں نے چچا صاحب سے پوچھا حضور یہ عورت کون ہیں انہوں نے کہا یہ ایک معزز تعلیم یافتہ طوائف ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ پان لگاکر گلوریاں اہل مجلس کو پیش کیا کرتی ہے۔ آخر میں یہ طریقہ جاتا رہا تھا۔

غالب و بیخبر

"قتیل اور غالب" میں سید اسد علی انوری فرید آبادی لکھتے ہیں خواجہ غلام غوث بیخبر جو گو غالب کے کمال شاعری کے معترف تھے پھر اس "قاطع برہان" والے جھگڑے میں مرزا سے متفق نہیں تھے۔ گو لحاظ دوستی کے بنا پر ان کے خلاف بھی کچھ نہ لکھتے تھے۔ خواجہ غلام غوث بیخبر سے

غالب کی دوستی کا معاملہ بھی خاصہ دلچسپ ہے۔ مرزا غالب کی اور قتیل کی دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ جس کا تھوڑا بہت بھی مرزا قتیل سے تعلق سن پاتے تھے اس کے بھی دشمن ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مولوی غلام امام شہید (شاگرد قتیل) وغیرہ سے بھی بیر تھا۔ خواجہ غلام غوث بیخبر غالباً مولوی شہید کے شاگرد تھے یا کم از کم ان کے مداح ضرور تھے عام حالات میں غالب کی مخالفت کے لئے اتنا تعلق کافی تھا لیکن یہاں اُلٹی مرزا دوستی کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے۔ اور غالب کو ان سے حصول مقاصد کی امید تھی اور صاحبان انگریز کی آمد و رفت۔ تبدیلی اور تعینات کی مزاج عادت وغیرہ ان کے ذریعہ معلوم ہوتا رہتا تھا، چنانچہ مرزا ان سے خوب نبھائے ہوئے تھے، بلکہ خاصے خوشامدانہ خط لکھتے رہتے تھے۔ ایک بار منشی حبیب اللہ ذکا نے مولانا غلام امام شہید کی غزل پر غزل لکھ کر مرزا غالب کو بھیجی مرزا صاحب نے غزل پر اصلاح تو دے دی لیکن اخیر میں خط میں مولانا شہید کو کیا کچھ لکھ دیا کہ منشی حبیب اللہ صاحب ذکا کو بہت ناگوار گزرا بلکہ کسی سے مرزا صاحب کی شکایت کی اور اپنی اہانت کا گلہ کیا خواجہ غلام غوث بیخبر کو یہ معلوم ہوا تو وہ بیچ میں پڑے اور فریقین کو کچھ لکھ لکھا کر صلح صفائی کرا دی۔[۵۱]

---

۵۱ قتیل و غالب صفحہ ۶۰

وضع ولباس | مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ سمجھو۔ صبح معمول تھا کہ ہوادار پر سوار ہو کر غسل کے لئے حمام کو جاتے۔ حسین و جامہ زیب تھے۔ کسرت اور ورزشی کرتبوں سے دلی لگاؤ تھا۔ مرتے مرتے قوائے جسم صحیح و سالم اور جوڑ بند مضبوط رہے۔

رکھ رکھاؤ | ملازمت کے دوران میں خودداری و وقار کا یہ حال تھا کہ میز منشی گری نہیں لفٹنٹی کرتے تھے۔ غدر کے بعد حکام کی جو روش ہندوستانیوں کے ساتھ ہوئی اسے کون نہیں جانتا۔ بڑے بڑے جی حضوری کہلائے۔ مگر انہوں نے اپنی وضع داری میں فرق نہ آنے دیا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ لارڈ میور کی پیشی کر رہے تھے۔ ایک کاغذ اڑ کر نیچے جا پڑا۔ لاٹ صاحب نے انھیں دیکھا آپ نے گھنٹی بجائی چپراسی آیا اور کاغذ اٹھا کر میز پر رکھ گیا۔ لاٹ صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ اگر میری خوشنودی چاہتے تو خود ہی اٹھا کر رکھ دیتے۔ منشی نے جواب میں کہا کہ حضرت یہ میرا کام نہ تھا قاعدے سے چپراسی اٹھاتا یا آپ خود اٹھاتے ... ... اگر آپ اس کے متمنی ہیں تو استعفیٰ حاضر۔ میور بہت خوش ہوا اور کہا اگر کبھی تم نے کاغذ اٹھایا ہوتا تو آج ہی تم سے استعفیٰ لے لیتا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

حفظ مراتب احباب | خواجہ صاحب میں احباب نوازی کے ساتھ حفظ مراتب کا بہت پاس تھا۔ مولانا غلام امام شہید امیٹھوی۔ حضرت

شیخ الاسلام بندگی نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے پوتے تھے ۔ اور خواجہ صاحب کے خسر خان بہادر مفتی انعام اللہ شہابی شیخ الاسلام کے نواسے تھے ۔ اس پاسداری سے ان کی بے انتہا عظمت و توقیر کرتے یہاں تک کہ لوگوں کو تلمذ کا شبہ ہونے لگا تھا ۔ آگرہ کے قیام میں حضرت امیر علی شاہ ۔ مرزا امام الدین بیگ قاضی میر باقر علیخاں ہمدانی ۔ بابو بینی پرشاد وکیل ۔ مولوی غلام سلطان لالہ لچھمی نرائن وکیل صدر ۔ مولوی طفیل احمد خیر آبادی ۔ شیخ محمد شفیع وکیل ۔ حکیم فخر الدین خاں ۔ مرزا ابراہیم بیگ ۔ شاہ محمد قاسم داناپوری ۔ قاضی محمد کاظم علی وکیل ۔ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبر آبادی ۔

محسن الدولہ محسن الملک نواب مہدی علی خان بہادر ۔ قاضی علی احمد بدایونی ۔ نواب عبد الباسط رئیس بازنی ۔ مولوی محمد روح اللہ منصف بسولی ۔ مولوی محمد وکیل منصفی شاہ آباد ۔ منشی حسین احمد خاں ۔ منشی امین الدین خاں مولوی محمد حامد ۔ سید محمد محسن خاں بہادر ذو القدر ۔ حکیم محمد شفیع صفی پوری مسٹر جمس طامسن بہادر صدر بورڈ ۔ مولوی امیر الدین احمد الہ آبادی ۔ خواجہ غلام نبی ۔ مسٹر ہیلیٹن صاحب بہادر ریزیڈنٹ اندور ۔ مولوی عنایت اللہ نواب عبد العزیز خاں ۔ شیخ یاور حسین یاور ۔ منشی ولایت علی خاں ۔ مولوی وکیل احمد مددگار صدر عدالت گلبرگہ ۔ حافظ محمد زکریا خاں زکی ۔ فدا علی عیش ۔ منشی علی عمر سکریٹری کتب خانہ اسلامیہ بمبئی ۔ شیخ رفعت علی حکیم قیام الدین

بخت جونپوری شمس العلما مولوی ذکا اللہ خان بہادر۔ محمد سعید الدین صدر منصرم سلطان پور۔ منشی نادر حسین خاں۔ خواجہ محمد بشیر لکھنوی۔ منشی امیر احمد مینائی تخلص امیر۔ مولوی سید ولایت حسین خان بہادر صدر الصدور۔ مولوی الطاف حسین حالی حافظ محمد جعفر خیر آبادی۔ مولوی رفیع الدین۔ افتخار الامرا فخر الملک نواب عبید اللہ خاں بہادر فیروز جنگ سی۔ ایس۔ آئی ٹونک۔ مرزا سید علی صفوی طہرانی حجازی تخلص۔ عبد اللہ شیرازی متخلص توکل۔ مولوی انوار الحق۔ مولوی خورشید علی خاں بہادر صدر الصدور الہ آباد۔ مولوی اظہار حسین خاں بہادر میر منشی گورنری۔ نواب سعد الدین خاں بہادر۔ مولوی عبد العزیز خاں بہادر صدر الصدور اعظم گڑھ۔ مفتی کرامت علی۔ مولوی نواب جان۔ مولوی علی بخش خاں بہادر۔ منشی نادر حسین خاں۔ منشی کریم بخش ڈپٹی کلکٹر جھانسی مولوی احمد علی سیماب۔ نواب محی الدولہ بہادر حیدر آباد۔ حضرت محمدی شاہ مجددی۔ مولوی محمد جواد تحصیلدار ضلع گورکھپور۔ منشی مظہر اللہ سررشتہ دار کلکٹری بجنور۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر وغیرہ۔

یہ وہ حضرات ہیں جن سے بیحد مراسم اور رسل رسائل تھے۔ فغان بیخبر۔ خونابہ جگر۔ رشک لعل گوہر میں ان کے نام خطوط ہیں۔

آخر میں مولوی نثار علی بیگ ڈپٹی کلکٹر اور مرزا وقار علی بیگ اکبر آبادی سے مراسم بڑھ گئے تھے۔ جب الہ آباد سے آتے تو اپنے مکان کے بجائے انھیں حضرات

کے یہاں اُترتے۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جب آگرہ آتے تو شیخ بلاقی زرسادہ کار کے ہاں ضرور جاتے۔ وطن کے باہر ہندوستان کے ہر حصہ میں احباب موجود تھے جیسا کہ خونابۂ جگر اور فغانِ بےخبر سے معلوم ہوتا ہے۔ مرزا غالب بے حد قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک رقعہ میں لکھتے ہیں:-

ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں۔ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولاد دیکھے ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا دوست خیر خواہ خلق۔ حسن و جمال چشم بد دور کمال مہر و وفا۔ صدق و صفا۔ نوراً علیٰ نور میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں۔ غایت مہر و محبت جس کے ملنے کا تم کو مالک سمجھتا ہوں وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتم دار سمجھا ہوا تھا۔ ایک کو تو میں رو لیا۔ اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا ہے۔

دعائیں مانگتا ہوں کہ خدایا اس کا داغ مجھے نہ دکھائیو

اس کے سامنے مردوں، میاں تمہارا عاشق صادق ہوں[۵۱]۔

فکر | فارسی تو لگاؤ تھا ہی، اردو میں بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیا کرتے تھے، حکیم تفضل حسین اکبرآبادی سے یہ شعر سنا ہے۔ نذر احباب ہے ؎

کیوں کر خبر کریں گے کسی بیخبر سے ہم
زخمی ہوئے ہیں آپ کی تیر نظر سے ہم

تصانیف | مولانا حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں کہ خواجہ بیخبر کے رقعات و نظم فارسی خونابۂ جگر کے نام سے شائع ہوئے رقعات و نثر اردو کا مجموعہ فغان بیخبر ہے۔ جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ بیخبر کے انتقال کے بعد ان کے ایک عزیز مولوی خواجہ حسین الدین بنارسی تحصیلدار نے بقیہ نظم و نثر کا مجموعہ رشک لعل و گوہر کے نام سے ۱۹۰۶ء / ۱۳۲۴ھ شائع کیا۔ بیخبر اردو کے بھی شاعر تھے۔ لیکن کم کہتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۶ء میں توجہ کی، یعنی غالب کے بھی کچھ پہلے تقریظوں میں بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانہ میں مقبول تھا۔ گویا تقریظ کا مفہوم نثر میں قصیدہ خوانی تھا۔ لیکن اور قسم کی نثر میں اس سے بہتر اور سلیس تر لکھی ہیں۔ چند خطوط دکھائے جاتے ہیں:-

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴۲

(۱) مولوی غلام امام شہید کی انشاء بہار بےخزاں کی ناسخ نے تقریظ لکھی ہے مختلف مقامات سے اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں
اللہ اللہ صفحہ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے
تارِ نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں
واہ واہ کلکِ گہر بار کی کیا دُرفشانی ہے

حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وکیفیت دکھائی ہے گویا درختوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے۔ کاغذ کی سفیدی ہر ورقوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے۔ جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے۔ اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا۔ میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا، ہوس کو پہلے ہی یہ خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا۔ یعنی در پردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیا کیا جلتا۔ ان کی اس نثر نے مزہ البتہ نظم کا کھو دیا۔ استادوں کا

سفینہ دریا میں ڈبو دیا۔

(۲) بیخبر نے شہید کا دیوان مرتب کرکے اس پر دیباچہ لکھا ہے اس کے متعلق شہید کو خط لکھتے ہیں :-

قبلہ میری شوخی دیکھئے یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معما حل کرتا ہوں۔ لعل کے حضور میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں ید بیضا کی چمک دیکھئے یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے۔ گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے ... ... میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو اس کے لئے شرف ہے اگر دیوان

میں داخل ہونے کی عزت اسے حاصل ہو۔"

(۳) سنجر نے اپنی انشا پردازی سے منظر کشی بھی کی ہے۔ صبح، دوپہر شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان مضامین میں مقفیٰ فقرے اور مبالغہ و تشبیہ وغیرہ بھی ہیں۔ اور سادہ سلیس عبارتیں بھی۔ دوپہر کے منظر کا اقتباس یہ ہے۔

دوپہر کا وقت ہوا۔ آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر تبخالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتش باری ہونے لگی۔ کہ ہوا نے شعلۂ جوالہ کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی۔

برہمن بت خانے کے کونے میں یوں خاموش ہو بیٹھا کہ بت بن گیا۔ میکدے میں مغ زانو پر سر رکھے اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا مٹکے پر پیالہ اوندھا دیا۔

غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگائیں مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا۔ خس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں۔

فرشی پنکھے کھچنے لگے۔ خس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا، صراحیاں برف میں لگائی گئیں، شربت کی قفلیاں جمائی گئیں" پہلے اور تیسرے نمونے کے خط کشیدہ فقروں میں کس قدر جدید موزوں اور مکمل تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ دوسرے فقرے میں لطیف ظرافت بھی ہے۔

بیخبر کا اسلوب نثر اس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے لیکن روش قدیم کا محاسن تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیخبر بیسویں صدی کے شروع تک رہے ہیں لیکن ان کا طرز نگارش بھی انیسویں صدی کے نصف اول کا ہے اور اسی زمانے کے لکھنے والوں اور غالب کے ہمعصروں میں ہیں۔ اس لئے ان کو اسی دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔[۱]

عود ہندی

عود ہندی کی ترتیب کی بنا یہ ہوئی کہ چودھری عبدالغفور سرور جو مرزا غالب کے شاگرد تھے انہوں نے اولاً خطوط کا مجموعہ "مہر غالب" کے نام سے مرتب کیا اور خود دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد عود ہندی کی ترتیب عمل میں آئی۔ منشی ممتاز علی خاں میرٹھی جو مہر غالب کے بھی محرک تھے

---

[۱] داستان تاریخ اردو مرتبہ مولوی حامد حسن صاحب قادری صفحہ ۲۵۱، ۲۶۶

عودِ ہندی کی نشر و اشاعت کے بانی و مبانی ہوئے۔ ان کی استدعا پر حضرت خواجہ غلام غوث بیخبر خان بہادر ذوالقدر نے "رقعات غالب بہ مشورہ و اعانت" مرزا غالب جمع کرنا شروع کیا۔ پہلی فصل میں مہر غالب دوسری فصل میں ۳۷، خطوط ۲ تقریظیں اور ۳ دیباچہ مرزا کے لکھے ہوئے ہیں۔ مرزا غالب خواجہ بیخبر ایک خط میں لکھتے ہیں :-

حضرت نسخہ عودِ ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آگیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں لیکن خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے۔ ان کو نکال ڈالا۔
کاتب لکھ رہا ہے میں مقابلہ کرتا ہوں[1]

پنڈت مہیش پرشاد صاحب عودِ ہندی کی ترتیب کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:-

اس میں شک نہیں کہ عودِ ہندی کی ترتیب میں مولانا بیخبر کی کارفرمائی کو بہت کچھ دخل تھا۔ وقتاً فوقتاً مرزا کی بھی مدد شامل حال تھی۔
چنانچہ مرزا غالب نواب انوار الدولہ شفق کو ایک خط میں لکھتے

---

[1] فغان بیخبر

ہیں۔ اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں
بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجئے
تو آپ کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجئے گا۔[۵۱]

دو ڈیڑھ برس میں یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ حضرت تجمّل نے مرزا کو لکھا:۔

جناب عالی میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا
ہے۔ الحمد للہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد
نواکر آج میں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ
کرتا ہوں اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی انھیں اختیار ہے[۵۲]

۱۸۶۶ء میں عود ہندی کا مجموعہ مرتب ہوا منشی صاحب نے عرصہ تک پڑا رکھا۔ پھر بے پروائی سے چھپوایا جس کا صدمہ جامع کو اور مصنف دونوں کو ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں طباعت سے فارغ ہوا تھا۔ اس کے بعد اُردوئے معلیٰ کی ترتیب عمل میں آئی۔

آگرہ کے دوران قیام میں وبائی مرض میں خواجہ صاحب مبتلا ہوئے تندرست جب ہوئے ہیں اس وقت مرزا تہر کو خبر لگی معذرت نامہ قطعہ کی صورت میں بھیجا۔

لکھتے ہیں:۔

۵۱؎ اردوئے معلیٰ ۵۲؎ فغانِ تجمّل

منشی غلام غوث ہیں مشہور بیخبر
ہمسا بھی بیخبر، نگر اُسے تھہر کم ہوا

ان کے علیل ہونے کا فضل و بائی ہیں
مطلق نہ ہم کو علم خدا کی قسم ہوا

اب جو سُنا تو رنج ہوا پر یہ شکر ہے
اس سے سوا خوشی ہوئی جتنا کہ غم ہوا

ہاتف نے ایک مصرع تاریخ پڑھ دیا

اچھی طرح سے ہیں یہ خدا کا کرم ہوا

وفات — بیخبر نے ۸ ارشوال ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء پونے دس بجے رات کے اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ دائرہ شاہ محمدی میں سپردِ خاک ہوئے۔ الہ آباد و بنارس میں کوئی یادگار باقی نہیں۔ اکبر آباد میں آپ کی اہلیہ محترمہ کا مکان چرپار ٹولہ متصل مسجد پیر چھنگا میں موجود ہے۔ بالو گنج میں چپل گڑھ کی کوٹھی آپ کی خریدکردہ تھی جواب بک چکی، پیپل منڈی والا مکان نکل گیا۔ گلاب خانہ والی حویلی کھنڈر برابر ہو گئی۔ آپ کے مزار پر یہ تاریخ کندہ ہے ؎

آں خواجہ کہ بود بنام او غلام غوث
خوش رو و خوش لباس خوش اندام و خوش سرشت

روشن شد از سواد بیاضِ صفات او
توقیع وصفی کہ بنامش قضا نوشت

در قیل و قال ہم نفس شاعران فرس
در وجد و حال ہم از خواجگان چشت

گوئی برنگ بوئے گل و چوں نسیم صبح
سوئے بہشت رفتہ و ایں کشت را بھشت

رضوانش دیدہ گفت کہ ایں نو رسیدہ کیست
گفتند حوریان جناں خواجۂ بہشت

۱۳۲۲

مولانا محمد انعام اللہ شہابی خان بہادر

مفتی انعام اللہ بن مفتی محمد اسحاق شہابی گوپاموی آپ کا سلسلہ نسب سولھویں پشت میں حضرت شیخ عماد الدین محمد بن شیخ الشیوخ شہاب الدین[۱] عمر سہروردی سے ملتا ہے۔

خاندانی حالات

حضرت یحییٰ بن شیخ عماد الدین محمد بغداد سے ملتان آئے اور والیٔ ملتان کے وزیر ہوئے۔ ان کے خلف الرشید شیخ احمد تھے۔ جن کے متعلق مراۃ العالم میں ہے۔

شیخ زادہ سہروردی است کہ شیخ احمد نام داشت وازخویشان شیخ شہاب الدین سہروردی بود کہ ہرشش خط را خوب می نوشت شاگرد یاقوت خطاط در شہر محرم سنہ ۶۹۱ھ وفات یافت۔

ان کے پوتے شیخ آدم بن محمد محدث وزیر ملتان تھے مگر ترک وزارت کی رسالہ النسا ملا وجیہہ الدین گوپاموی میں لکھا ہے۔

شیخ آدم محدث از سلطان وقت رنجیدہ وزارت ترک کرد

---

[۱] نفحات الانس جامی   [۲] ابن خلکان

وقلم را بہ خرق عادت مارساختہ اُچ ملتان بگذاشت وسیر کنان
در ہشت صد ہجری دریں مرز بوم (گوپامئو) آمد متوطن شد۔

شیخ آدم نے گوپامئو میں وفات پائی ان کے پسر شیخ بن آدم جلیل المرتبہ عالم اور صاحب درس وتدریس اور مفتی گوپامئو مقرر ہوئے۔

مفتی محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم مولانا جلال الدین دوانی مولانا علی نیر کے معاصر تھے۔ ان کے صاحبزادہ شیخ آدم ثانی دانشمند چشتی نواسہ شیخ احمد بن شیخ فرید چشتی تھے۔ تلمذ شیخ معروف جونپوری سے تھا سنہ ۹۳۲ھ میں ظہیر الدین محمد بابر نے التمغیٰ امرحمت کیا اور مفتی گوپامئو مقرر کیا سنہ ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی۔

مولوی مصطفٰے علی خاں تذکرۃ الانساب میں لکھتے ہیں:۔

شیخ آدم مفتی صدیقی از فرزندان شیخ شہاب الدین سہروردی
اند با دختر حضرت مخدوم اللہ دیہ الرضوی خیرآبادی کہ بی بی
جمیلہ نام بود کتخدا بودند از ایشان شیخ عیسٰی مفتی متولد شدند
شیخ عیسٰی با دختر بندگی جعفر ابن قطب الاقطاب حضرت بندگی
نظام الدین عثمانی امیٹھوی کتخدا شدند از بی بی سہ پسر
یکے ملا معز الدین، دوم شیخ حبیب اللہ سوم ملا وجیہ الدین
ہستند۔ مفتی حبیب اللہ در قصبہ ہرگام با دختر قاضی صدر الدین
ہرگامی کتخدا شدند از ایشان دو پسر یکے شیخ عیسٰی عرف

شیخ میاں دوئم علیم اللہ مفتی متولد شدند۔ مفتی علیم اللہ در امیٹھی در فرزندان حضرت بندگی کتخدا شدند از ایشاں دو پسر یکے مفتی ابوسعید و دوم محمد غوث و سہ دختر متولد شدند۔ مفتی ابوسعید در فرزندان حضرت مخدوم سید اللہ دیہ خیر آبادی کتخدا بودند از ایشان دو پسر یکے مفتی محمد امان دوم شیخ عبد الغنی و دو دختر متولد شدند مفتی محمد امان با دختر معز الدین مفتی کہ نواسہ فرزندان حضرت بندگی بودند کتخدا شدند ازیں بی بی یک پسر مفتی محمد ولی نام بود و سہ دختر متولد شدند مفتی محمد ولی با دختر شیخ نجیب الدین ابن فخر الدین مسطور کتخدا شدند از ایشاں چہار پسر یکے مفتی محمد یحییٰ دوم مفتی محمد اسمٰعیل سوم مفتی محمد اسحاق، چہارم محمد یعقوب متولد شدند۔

مفتی شیخ عیسیٰ صوفی محدث علامہ وجیہہ الدین گجراتی کے شاگرد و خلیفہ تھے۔ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۲۳ھ کو انتقال ہوا۔[۱]

علامہ وجیہہ الدین مؤلف فتاویٰ عالمگیری منصب دار سہ ہزاری تھے مرات العالم میں تفصیلی حال ہے۔ ۵ رجب ادی الثانی ۱۰۸۲ھ میں انتقال ہوا۔ مفتی ابوسعید متوفی ۱۰۴۷ھ صاحب بحر الحقائق ان کے خلف مفتی محمد امان

[۱] تذکرۃ المتقین

متوفی ۱۱۷۰ھ ان کے پرپوتے مفتی محمد اسمعیل جو مدراس کے ضلع جتور کے قاضی
دائرو سائر تھے ۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا۔ نکات تفسیر یادگار ہے۔ ان کے
برادرزادہ مفتی انعام اللہ سبط محمد بندگی از احفاد حضرت واسع بن بندگی علیم بن نظام الدین
عثمانی امیٹھوی تھے۔ مفتی انعام اللہ نے اپنے والد اور علمائے عصر سے
اکتساب علم کیا۔ بعد فراغت علم لکھنؤ آئے۔ چکلہ داری کے ملنے کی توقع
پر کچھ عرصہ گذرا۔ عدم کامیابی پر کلکتہ پہونچے۔ اپنے کو روشناس کرانے
کے لئے محفل مشاعرہ منعقد کی۔ اس تقریب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر کلبرک نے
اپنے لڑکے مسٹر شیر اصاحب کو آپ کی خدمت میں فارسی تعلیم حاصل کرنے بھیجا۔
جب مسٹر کلبرک ریزیڈنٹ قرار دے کر دہلی بھیجے گئے وہ مفتی صاحب کو
اپنے ہمراہ لائے اور اپنے محکمہ کا سررشتہ دار مقرر کیا۔ دربار شاہ دہلی سے
خطاب خانی ملا۔ کلبرک ولایت روانہ ہوئے تو محکمہ قضاۃ کا مفتی (وکیل)
آپ کو مقرر کیا گیا۔ جب محکمہ قضاۃ توڑا گیا تو مفتی صاحب صدر نظامت
الہ آباد میں وکیل مقرر کئے گئے۔ یہ صدر جب آگرہ منتقل ہوا تو آگرہ آئے نیل
کھاتہ میں اقامت پذیر ہوئے۔

مفتی صاحب کا مکان ہی علما کا مرکز تھا کہ جہاں علمی مذاکرہ ہوا کرتے
تھے۔ اور اہل علم حضرات آکر ٹھہرتے تھے۔ حضرت کالے صاحب دہلی
سے جب آگرہ آئے تو یہاں مقیم ہوئے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی سے اور

مفتی صاحب سے قرابت قریبہ تھی۔ قاضی صدر الدین ہرگامی کی اولاد ذکور سے فضل حق تھے اور اناث سے مفتی انعام اللہ تھے۔

حضرت سید احمد علی خاں عرف ضیاء الدین مخاطب دلاور جنگ احمد اللہ مشہور ڈنکا شاہ جو نواب چنیا پٹن کے صاحبزادہ تھے۔ امارت کو ترک کرکے سیاحت کی۔ حضرت محراب شاہ قادری گوالیاری کے مرید ہوئے۔ اور خرقہ خلافت عطا ہوا۔ یہاں سے آگرہ آئے تو مفتی صاحب کے یہاں ہی مقیم ہوئے آپ کے خلف مولوی اکرام اللہ مرید ہوئے۔ اور مفتی صاحب کے یہاں جو علماء شریک ہوتے شاہ صاحب کی ہمت افزائی کرتے۔ اس پر شاہ صاحب نے سکھوں اور پوربیوں کی سرکوبی کے لئے مریدین سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا۔

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ وکیل مولوی شیخ امام بخش وکیل۔ سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی۔ مولوی نور الحسن مثل خواں محکمہ صدر۔ سید مراتب علی نائب سررشتہ فوجداری۔ مولوی خواجہ تراب علی وکیل سید حسن علی مختار۔ سید رحمت علی وکیل۔ مولوی حافظ ریاض الدین مفتی عدالت آگرہ۔ مولوی جیلانی وکیل۔ سید غلام مرتضیٰ مختار۔ شیخ محمد شفیع وکیل۔ مولوی محمد عبدالصمد مولوی منصب علی۔ مولوی محمد عظیم الدین حسن رضوی پیشکار صدر۔ منشی محمد رسول بخش سررشتہ دار۔ مولوی محمد باسط علی۔ شیخ محمد مومن علی وکیل۔

مولوی محمد قاسم داناپوری مثنل خواں۔ مولوی معین الدین منشی۔ دفتر اسسٹنٹ رجسٹرار صادر۔ مولوی محمد کریم اللہ خاں صدر الصدور۔ قاضی محمد کاظم علی وکیل۔ حکیم نظام علیخاں افضل۔ مولوی وہاج الدین منشی صادر۔ مولوی طفیل احمد خیرآبادی وکیل صدر۔ مولانا غلام امام شہید مفتی محمد عبدالوہاب گوپاموی وغیرہ مفتی صاحب کے احباب اور متوسلین سے تھے۔ ہر ایک سنے دامے درمے قدمے حضرت احمد اللہ شاہ کی معاونت کی مفتی صاحب نے اپنی سواری کا گھوڑا اور شمشیر بجلی جو کمر میں لپیٹ لی جاتی تھی وہ شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کی اور مالی معاونت کی شاہ صاحب کا آگرہ میں دوسرا دورا تھا۔ کچھ عرصہ انھوں نے نالہ پیپل منڈی میں مولوی غلام غوث خان بہادر ذوالقدر کے مکان کے متصل مکان کرایہ پر لے لیا۔ روزانہ محفل سماع منعقد ہوتی۔ ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم بیان فرماتے تھے کہ محفل سمع میں کوئلہ کے انگارے پھیلائے جاتے تھے۔ اس پر صاحب حال حال لاتے تھے خود بھی ڈاکٹر صاحب شریک محفل ہوئے تھے۔ مشائخین سور کا چراغ گل ہونے لگا تو چند بدمعاشوں کو آمادہ کیا کہ حال لاتے ہوئے شاہ صاحب کو ایذا رسید کی جائے۔ چنانچہ محفل سمع منعقد تھی۔ حال لوگوں کو آرہے تھے شہر کے الفنسن بھی شریک ہوئے اور وجد کھیلتے ہوئے شاہ صاحب کیطرف کو اپنے اشارہ کیا انگارے پھیلائے گئے۔ ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ چند

منٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ پھر شاہ صاحب کے لات رسید کرنے کے لئے مشائخین کیساتھ حال لاتے ہوئے آنکھ بند کئے گئے اور پھر لوٹے تو پیٹ جل گئی بھاگے مگر صحیح حال لانے والوں کے لئے آگ گل گلزار سے کم نہ تھی۔

کچھ عرصہ بعد ہی یہ سنا کہ حضرت امیر علی شاہ امیٹھوی کو ہنومان گڑھی پر نواب اودھ کی فوج نے شہید کرادیا اس پر شاہ صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے۔ ہنومان گڑھی پہونچے وہاں سے لوٹ کر پھر لکھنؤ آئے کہ یکایک ہنگامہ ۵۷ء رونما ہوا اس میں شریک رہے۔

ادھر تو شاہ صاحب روانہ ہوئے اور ادھر تمام حکام صدر اور وکلاء و اہلکاران پر رشوت ستانی کے مقدمات قائم ہو گئے مفتی صاحب بھی اس لپیٹ میں آئے۔ مولانا غلام امام شہید مولوی محمد قاسم داناپوری شیخ محمد شفیع وکیل۔ غرض کہ کل علماء و فضلاء صدر پر بلا نازل ہوئی اور ولسن کلکٹر سماعت مقدمہ کے لئے مقرر ہوا۔ مفتی صاحب کے داماد خواجہ غلام غوث خان بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹننٹ گورنر مغربی و شمالی کے تھے۔ مگر کچھ ایسا راز تھا کہ وہ بھی اپنے خسر کی سفارش نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ثبوت باہم نہ ہو سکا۔ صرف مولوی محمد قاسم صاحب پر فیصلہ چھ ماہ کی سزا کا بحال رہا۔ مگر اپیل سے خارج ہوا۔ وکلا اور عہدہ دار صدر جو ولسن گردی کے لپیٹ میں

تھے انہوں نے ترک وکالت کی اور ملازمتیں چھوڑ دیں مفتی صاحب نے وکالت چھوڑ کر ٹونک کا رخ کیا۔ نواب وزیر الدولہ امیر الملک وزیر خان بہادر نصرت جنگ نے مفتی صاحب کی آؤ بھگت کی سنہ ۱۲۲۹ھ میں اپنی ریاست کا مہتمم بندوبست کر دیا۔ چار پانچ سال قیام کو نہ گزرے تھے کہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔

آپ کے صاحبزادہ مولوی اکرام اللہ آگرہ لے آئے۔ یہیں ۱۵ ر شوال سنہ ۱۲۷۴ھ کو انتقال ہوا۔ احاطہ شاہ امیر ابو العلا احراری میں دفن ہوئے۔ مفتی صاحب کو مولوی منظم الحق فاروقی صدر الصدور مدراس بنی عم نواب محمد علی والاجاہ والی مدراس وسبط قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح سلم گوپاموی کی دختر مناکحت میں تھی۔ کثیر التعداد کتب کے مصنف بھی ہیں۔ تہذیب الاخلاق خزینۃ الاولیاء۔ شعر الشعرا۔ ماثر العلما زیادہ شہرت پذیر ہیں۔

مولانا غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ

مولانا غلام امام شہید خلف شاہ غلام محمد امیٹھوی ثم الہ آبادی

خاندانی حالات | جناب شہید کے مورث اعلی شیخ الاسلام بندگی حضرت مخدوم

نظام الدین عثمانی امیٹھوی تھے ۔حضرت بندگی کا زمانہ عہد اکبری کا تھا ۔
علامی ابوالفضل آپ کے بہت معتقد تھے ۔ اور ملا عبدالقادر بدایونی بھی
فضل و کمال کے معترف تھے ۔آپ مخدوم شیخ آدم صدیقی گوپاموی کے
داماد تھے شیخ بندگی کے چار صاحبزادے تھے ۔ مخدوم شیخ جعفر بندگی جن کے
نواسے علامہ وجیہ الدین گوپاموی تھے ۔ دوسرے شیخ عبدالرزاق ۔تیسرے
شیخ عبدالجلیل انھیں شیخ عبدالجلیل کی اولاد سے شاہ غلام محمد تھے اور چوتھے شیخ محمد
جن کے پرپوتے ذکریا میاں تھے ۔ انھیں کے نواسے منشی انعام اللہ الشہابی
خان بہادر گوپاموی تھے ۔

شاہ غلام محمد عابد امیٹھوی سے تھے علم و فضل کے ساتھ فقر سے بھی
لگاؤ تھا ۔ مجاہدہ و ریاضت میں عمر تمام کی ۔

سوانح

۱۲۱۴ھ میں حضرت شہید پیدا ہوئے ، ابتدائی کتب باپ سے
تحصیل کیں بعد کو مولوی حیدر علی سے علوم عقلیات و نقلیات کی
تکمیل کی منشی اکرام اللہ الشہابی گوپاموی تصویر الشعرا میں لکھتے ہیں :-

"علوم متداولہ از مولوی حیدر علی اکتساب نمودہ"

بعد تحصیل علم سرکاری ملازمت اختیار کی کچھ عرصہ تک تحصیلدار
صدر نظامت میں منسلک ہو کر آگرہ آئے یہاں سررشتہ داری تک
علمی ذوق و شوق تھا ، فارسی اہل زبان سے حاصل کرنے کے خیال سے نظم و

نثر میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے استفادہ کیا۔ اُردو میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ "اوّلاً مرزا قتیل فرید آبادی و مصحفی ہمدانی تلمذ دارد و در نظم و نثر فارسی از آغا سید اسمٰعیل مازندرانی مشورہ کردہ۔"[۵۱]

واقعہ | دلّی گردی میں حضرت شہید بھی پھنسے جس کی وجہ سے سررشتہ داری چھوڑی اور ملازمت ترک کی اس کے بعد ہی جناب شہید کی منجانب سرکار نظام چار سو تیس روپیہ سالانہ مقرر ہوئے۔

منجانب سرکار نظام الملک چار صد و سی روپیہ سالانہ بلا شرط خدمت مقرر است۔[۵۲]

تصنیف و تالیف | آگرہ کے قیام میں میلاد شریف تحریر کیا اور آگرہ ہی میں نشی خواجہ غلام غوث بیخبر خان بہادر ذو القدر کی فرمائش سے "بہار سخن" لکھی (ا) سر سالار جنگ بہادر حیدر آبادی۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور نواب سعید عالم رئیس صورت آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ امرائے حیدر آباد میں سے محی الدولہ محمد یار خاں آپ کے خاص معتقد تھے۔ سالانہ ۱۲ ربیع الاول کو محی الدولہ اور افضل الدولہ کے یہاں میلاد کی محفلیں ہوا کرتی تو آپ خود آگرہ الہ آباد سے جاکر میلاد پڑھتے فرماتے ہیں ؎

فرشتوں تک پہونچتی ہے جو خوشبو — تو کہتے ہیں کہ یہ مجلس کہاں ہے
محی الدین کے گھر میں ہے مجلس — کہ اس سے عطر پرور مغز جاں ہے

۵۱ تصویر الشعرا

۵۲ تصویر الشعرا

آگے کہتے ہیں :-

سنوں چل کر ثنا خوان پیغمبرؐ
دکن میں طوطیٔ ہندوستاں ہے

فضیلت علمی کے اعتبار سے امتیاز خاص حاصل تھا۔ شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے آپ کی نظم و نثر کی دھوم تمام ہندوستان میں تھی۔ خواجہ غلام غوث بیخبر خونابۂ جگر میں لکھتے ہیں :-

خاقان سریر آرائے کشورستان نکتہ دانی خار رشک در جگر شکن انوری و خاقانی فرید وحید مولانا غلام امام شہید رح

حضرت شہید ادیب کامل اور ناثر بے بدل تھے اپنے طرز کا جواب نہیں رکھتے تھے آپ کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق صادق تھا حضورؐ کے نام کے متوالے تھے۔

میرے چچا ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم فرماتے تھے۔ کہ حضرت شہید حج کو گئے۔ راہ میں جہاز گرداب میں آیا ناخدا پریشان کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو اس نے حجاج سے کہا کہ اب میرے بس کی بات نہیں تھوڑے عرصہ بعد سب لوگ تہ آب ہوا چاہتے ہیں۔ حجاج میں کچھ لوگ حضرت شہید کے پاس آئے یہ مصلے پر بیٹھے تسبیح میں مشغول تھے گریہ کناں ہو کر کہنے لگے حضرت اب کیا کریں موت نے سب کو آگھیرا حضرت شہید سن کر کھڑے ہو گئے اور

زور سے یا رسول اللہ مدد کیجیے کہہ کر عرشہ پر گر پڑے۔ آپ کا گرنا تھا کہ جہاز گرداب بلا سے نکل گیا اور بخیر و خوبی چند روز بعد ساحل پر جا لگا۔

تصانیف | بہارِ بے خزاں۔ میلادِ شہید۔ کلیاتِ شہید۔ دستورِ عرائض نویسی۔ یادگار رہے ہیں۔

وفات | بعمر پختہ سالگی ۱۲۹۳ھ میں وصال۔

قطعہ تاریخ انتقال مولانا غلام امام شہید

شاعرِ بے مثل غلام امام — ساحری از شاعریش شد پدید
بود بہ الطافِ نہ ہمیں یک صفت — عالمِ یکتا و ادیبِ وحید
صوفی صافی دل و روشن ضمیر — حاجی و مداحِ رسولِ حمید
قطعِ تعلق ز ہمہ کار کرد — داد دل و عشقِ پیمبر خرید
داشت امامِ شعرا در خطاب — خوش سخن کرد تخلص شہید
خنجر بران اجل ناگہاں — از دمِ خود تارِ حیاتش برید
تافت ازیں عمر کدہ تیرہ او — رفت بہ گلزارِ ارم آرمید
بہر غم زدہ اندر غمش — چارہ بجز صبر و رضا چوں ندید
گفت تاریخ ہم آخر ز رنج — وائے امامِ شعرا شد شہید

احباب

نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی

مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب خلف عبد اللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا، سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ۱۲۱۲ھ میں کالے محل کے متصل والی حویلی میں پیدا ہوئے۔ یہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے باپ الور کے قریب ایک جنگ میں کام آئے۔ اس وقت ان کے چچا نصر اللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ انھوں نے ہی مرزا کو پالا۔ ان کے مکان کے قریب مولوی محمد معظم کا مکتب تھا جہاں مرزا صاحب نے تحصیل علم کی۔ انکے بھائی مولوی محمد کامل علمائے عصر میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ محمد معظم فارسی ادب کا مایۂ ناز ماہر تھا۔ اور محمد کامل نجوم ہیئت و ہندسہ میں یگانۂ روزگار اور تجوید قرون اور ادوار تھے[1]۔ ایسے لوگوں کی صحبت نے مرزا کو صاحب کمال وعلم بنا دیا۔

مرزا علوم درسی کی تحصیل گو طالب علمانہ طور سے نہ کر سکے لیکن بقول خود

---

[1] گلستان سخن صفحہ ۲۶۲

ان کی طبیعت کو فارسی سے مناسبتِ ازلی تھی۔ شوقِ زبان نہ گیا۔ ۱۴ برس کی عمر میں ملا عبد الصمد ایرانی کی دو برس صحبت میسّر آئی مگر زیادہ تر مبدۂ فیاض سے مستفید ہوئے۔

آنچہ در مبدأ فیّاض بود آنِ من ست
گل جدا ناشدہ از شاخ بدامانِ من ست

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے۔ ۱۲۲۵ھ میں بعمر ۱۳ سال اُن کا عقد نواب فخر الدولہ برادر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی دختر نیک اختر کے ساتھ ہو گیا۔ اس تقریب سے دلّی آنا جانا ہوا۔ آخر کار دلّی ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ آگرہ کے قیام میں جس محلّہ میں رہتے تھے وہ اس وقت علمی مرکز بنا ہوا تھا۔ وہیں مُلّا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم رہتے تھے وہیں اُن کے صاحبزادے مولوی شمس الضحیٰ و بدر الدجیٰ رہتے تھے۔ اور اُن کے ہمشیر زادہ مولوی اعظم علی اعظم مترجم سکندر نامہ رہا کرتے تھے۔ تھوڑے سے فاصلہ پر قاضیوں کا علمی گھرانا آباد تھا۔ ان میں منشی حسین علی خاں متخلص بہ قاضی واجد علی خاں کے بھائی تھے۔ جو عرصہ دراز تک سرکار مہاراجہ گوالیار مختار رہے۔ ایسے ایسے ذی علم حضرات کی صحبت نے مرزا صاحب کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا اس زمانہ میں میاں نظیر کی شاعری کا بھی بڑا چرچا تھا۔ اس کا اثر مرزا پر

یہ پڑا کہ ایک نظم پتنگ پر اُنھوں نے لکھی تھی۔ مگر طبیعت کا میلان اس طرف نہ تھا۔ مرزا فکرِ سخن کم عمری سے کرنے لگے تھے۔ اُن کے اشعار نواب حسام الدین حیدر خاں نے جناب میرؔ کو دکھائے اس پر میرؔ نے کہا اگر اس لڑکے کو کوئی اُستادِ کامل مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر ہوگا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

شعر گوئی اور زورِ طبیعت کا یہ نتیجہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مرزا کے کلام کو شہرت ہونے لگی اور اُستاد مانے جانے لگے۔ دلی اس وقت اہلِ علم کی مجلس تھی۔ قدردانوں کا جمگھٹا تھا۔ مولانا فضل امام صدر الصدور کے خلف مولانا فضل حق و مولوی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ سے لوگ مرزا صاحب کے ملنے والے تھے اس سے اور طبیعت میں جولانی پیدا ہوئی سنہ ۱۹۳۰ھ میں مرزا نواب احمد بخش خاں کے معاملہ میں کلکتہ گئے راہ میں لکھنؤ ٹھہرے۔ قدردانوں نے خاطر مدارات کی۔ روشن الدولہ نائب السلطنت سے بھی مرزا کی ملاقات طے پائی تھی لیکن یہ صرف اس وجہ سے نہ مل سکے کہ اُنھوں نے دو شرطیں ایسی پیش کیں تھیں کہ منظور نہ ہوئیں۔ اول یہ کہ نذر سے معاف رکھا جاؤں اور دوم یہ کہ نائب میری تعظیم دیں غرضکہ وہاں سے کلکتہ پہونچے۔ مرزا یہاں کچھ عرصے ٹھہرے مگر ان کے صفات و کمالات کی قدر نہ ہوئی جس کام سے گئے تھے وہ بھی نہ ہوا۔ بیچارے یونہی چلے آئے۔

اس وقت تک مرزا بزرگوں کا متروکہ سرمایہ تمام کر چکے تھے لیکن طرز رہائش وہی امیرانہ تھی وضعداری میں فرق نہ آیا۔ بے فیض سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے جو امرا اُن کے مکان پر ملنے نہ آتے تھے اُن کے یہاں جانا بھی عار سمجھتے تھے۔

دلّی میں وغیر بیرون جات میں مرزا کے قدر دانوں کی کمی نہ تھی لیکن افسوس کی بات ہے کہ دربار میں اُن کی پوری قدر نہ ہوئی۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے قریب اُن کی پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی اور نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب ملا اور خاندانِ مغلیہ کی تاریخ نویسی کی خدمت سپرد ہوئی جس کا صرف پہلا حصہ مہر نیم روز ہی تمام ہونے پایا تھا کہ غدر ہوگیا۔ دوسرے حصہ کا نام مرزا نے ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔

یہ وقت سلطنتِ مغلیہ کا وقتِ نزع تھا جسم ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ جان صرف سینہ میں اٹکی ہوئی تھی۔ مرزا بھی سلطنت سے وابستہ تھے اس لئے پریشان رہا کرتے تھے تنخواہ کبھی سہ ماہی کبھی ششماہی ملتی تھی۔ اور کبھی یہ بھی نہیں۔ سنہ ۵۷ء کے ہنگامہ میں سخت مصیبت کا سامنا ہوا تنخواہ بالکل ہی بند ہوگئی اور سرکاری پنشن بھی دو برس تک نہ ملی مرزا سخت پریشان رہے۔

سنہ ۱۸۵۹ء میں رام پور گئے والیٔ ملک شناسا اور شاگرد بھی تھا۔ ناظم تخلص تھا۔ نہایت احترام سے جاگیرداری کی سو روپیہ ماہوار کچھ عرصہ سے اُن کے یہاں سے

مقرر ہو چکے تھے جو تمام عمر ملتے رہے۔ جب مرزا رخصت ہوئے تو مزید عنایات سے شاگرد نے رخصت کیا۔

سال بھر بعد سات سو روپیہ سال پنشن بھی جاری ہو گئی لیکن مرزا تنگدست ہی رہے۔ اخراجات کی وسعت اور اپنی فراخ حوصلگی کے ہاتھوں مرزا کو فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی۔

آگرہ اکثر مرزا آیا جایا کرتے۔ ایک مرتبہ آپ آئے تو نیل کھاتہ میں مجلس احباب منعقد ہوئی۔ مرزا حسام الدین بیگ، خواجہ غلام غوث بیخبر وغیرہ سخن سنج شریک مجلس تھے شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں فرقۂ اہل نشاط سے ایک رقاصہ صنم تھی جس کا شہرہ بہت تھا اور خود بھی فکر سخن کرتی تھی وہ بھی شریک مجلس ہوئی۔ مرزا صاحب نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا ؎

زر افشاں مانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالہ ہے
غضب یہ ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے

نواب ضیا الدین احمد خاں اکبر آباد گئے کچھ عرصہ تک ٹھہرے مرزا انکو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلی سے اس طرح لکھتے ہیں:۔

"جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد یعنی آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد۔ گرفتم کہ خود را بہ سفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) ذنزدیک خود (یعنی بدانستِ خود) از من دور تر رفتہ آید، آیا چوں ہنوزم در وطنید ہمانا

که نزدیک باشید. شادم که شوقِ دوراندیش دیده و دل را درین
سفر با شما فرستاد تا هم درین غربت (یعنی در دهلی) داد شادمانی
دیدارِ وطن نیز توانم داد. زنهار اکبرآباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت)
ننگرند، و از رهگذارهای آن دیار انجینظ گوی والایان سرای
گذرند. آن آباد چه ویران دیرانهٔ آباد بازیگاه هم چو من مجنونی
و هنوز آن بقعه‌ها بهر کف خاک چشمهٔ خونی ست. روزگاری بود
که در آن سرزمین جز جهرگیا (نام رستنی) نه رستی و هیچ نهال جز دل
بار نیاوردی. نسیم صبح در آن گلکده (یعنی آگره) به مستانه وزیدن
دلها را آن مایه از جا برانگیختی (یعنی بشورش آوردی) که رندان
را هوای صبوحی از سر و پارسایان را نیت نماز از ضمیر فرو ریختی
هر چند هر ذرهٔ خاکِ آن گل زمین را از تن پیامی بود دل نشین،
و هر برگ آن گلستان را از جان درودی بود خاطرنشان، اما تازگی
وقت شما را در نظر داشته در دو پرده شور پرسش برانگیخته بود و
چشم براه داشت که کسی نویسند و دریغ که هیچ‌گاه نه نوشتند
که رخش شبگیر (یعنی اسپ سنگین که در اکبرآباد معروف است)
دعای مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بپاسخ سلام من بزبان
موج چه گفت؟

آخر عمر میں مرزا کو ضعیفی نے بہت ستا رکھا تھا۔ ہر وقت خاموش لیٹے رہا کرتے تھے۔ ثقل سماعت ہو جانے کی وجہ سے یہ نوبت پہنچی تھی کہ لوگ تحریر سے بات کیا کرتے تھے۔ غذا صرف یہ رہ گئی تھی کہ صبح ۵ - ۷ بادام کا شیرہ دوپہر کو یخنی اور شام کو چند شامی کباب۔ آخر ۱۵ر فروری سنہ ۱۸۶۵ء کو ۷۳ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر اکبر آبادی

مرزا حاتم علی بیگ مہر خلف مرزا فیض علی بیگ قزلباش بن رکن الدولہ مرزا امراؤ علی خاں بہادر،

خاندانی حال | مرزا نے خود اپنا خاندانی حال یہ لکھا ہے:-

"پر دادا میرے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان میں اصفہان سے آئے، دادا میرے مرزا امراؤ علی خاں بہادر مصاحب خاص ندیم باختصاص نواب شجاع الدولہ بہادر اور ناظم علاقہ دلمؤ بریلی رہے۔ والد ہمیشہ عملداری سرکار انگریز بہادر میں تحصیلدار

(علیگڑھ میں) لکھے۔[۵۱]

سوانح

جناب مہر ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے چار برس کی عمر تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے اپنے حسنِ انتظام سے رسمی تعلیم دلوائی ابتدائے سِن سے شعر کہنے لگے۔ پندرہ برس کی عمر میں مشق اچھی تھی۔ اُن کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی ماہ وہ بھی شعر و شاعری سے شوق رکھتے تھے۔ جناب مہر حضرت ناسخ کے شاگرد ہوئے اور جناب ماہ نے آتش سے تلمذ اختیار کیا۔

۱۸۴۰ء میں سند عہدہ منصفی کی حاصل کرکے چنار گڑھ کے منصف ہو گئے اس کے بعد وکالت کی سند صدر نظامت سے حاصل کی ۱۸۵۷ء کے واقعہ آزادی یعنی ہنگامہ میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا اس کام میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر کے ماموں شریک تھے۔ لکھنؤ سے آگرے گئے وہاں اس کے صلہ میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور مرحمت ہوئے[۵۲]۔ اس کے بعد سے آگرہ ہی وطن ہو گیا۔ منشی ولایت علی انجینیر مرحوم کے مکان واقعہ نالہ پیپل منڈی متصل مسجد نواب معتمد خاں میں رہتے تھے آخر زندگی تک شغل وکالت قائم رہا۔ کچھ عرصے کے لئے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔

خلیق متواضع اور پابندِ وضع تھے۔ مذہب اثنا عشری تھا مگر غلو نہ تھا

---

۵۱ شعر و سخن مرتبہ نیاز علی پریشان صفحہ ۱۰۱ ۵۲ آبِ بقا۔

خلوص کے بندے تھے۔

مرزا غالب۔ مولوی غلام امام شہید۔ خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر مولوی اکرام اللہ صدیقی۔ میر وزیر علی صبا۔ تنیر۔ دبیر وغیرہ حضرات سے تعلقات دوستانہ تھے۔

آگرہ کی علمی مجلس کے ایک رکن یہ بھی تھے۔ آپ کے یہاں بھی اکثر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر والئے کاشی مقیم آگرہ ان کے شاگرد تھے وہ پچاس روپیہ ماہوار نذر کیا کرتے تھے" آپ کے صاحبزادے مرزا سخاوت علی بیگ ایٹہ میں تحصیلدار تھے اُن کے پاس آپ گئے ہوئے تھے کہ داعیٔ اجل نے لبیک کہا ۱۸ اگست ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) میں سپرد خاک ہوئے۔

تصانیف صاحب تصانیف کثیرہ ہیں گو ابتدائی عمر لکھنؤ میں گزری مگر آگرہ کی زبان پسند خاطر تھی لکھنوی طرز میں قیام آگرہ سے کمی آگئی تھی۔

"مرزا صاحب کے کلام میں روزمرہ اور محاورہ کے لطف کے ساتھ کلام میں پختگی اور ترکیب میں متانت اور مضامین بلند ہیں بعض بعض مقام پر استعارات اور تشبیہیں فارسی کی بھی موجود ہیں۔ کلام کو رنگین اور بلند کر کے دکھانے میں خاص ملکہ رکھتے تھے کہیں سادہ شعر میں ایسا مزہ پیدا کر دیا ہے جسے

سن کر آدمی پھڑک اٹھے"۔

تجھ سے تو ہے امید ہمیں لطف و کرم کی
ہوگا کسی کافر ہی کو ڈر روزِ جزا کا

فہرست تصانیف

الماس درخشاں دو دیوان ۔ پارۂ عروض (اردو) ایاغ فرنگستان (تاریخ) مطبوعہ سنہ ۱۸۷۳ء۔ داغ نگار (مثنوی) داغ دلِ مہر (واسوخت) شبیہہ عشرت ۔ ذاب انتقام (واقعہ مختار) شجاعِ مہر[52] (مثنوی سنہ ۱۲۷۵ھ میں مطبع حیدری آگرہ میں طبع ہوئی جس کی تعریف مرزا غالب نے اپنے رقعات میں کی ہے)

ہمدم آخرت ۔ بیان بخشائش ۔ عہد قیصریہ ۔ پنجۂ مہر ۔ توقیر شرف وغیرہ مختلف مقاصد پر نظم کہی گئی ہیں ۔ تاریخ گوئی میں بھی خاص کمال تھا ۔ خارِ عشق (دیوان غیر مطبوعہ) انجام عشق کشکول مخمس و مسدس و رباعیات و قطعات وغیرہ ایام غدر میں لٹ گئے۔

اس عہد میں ہر اک متہ چرخ کہن لٹا
اوروں کا زر لٹا میرا نقدِ سخن لٹا

قاعدہ نظم ۔ محیط آشنا (تذکرہ ان شعرا کا جن سے ملاقات ہوئی) یہ سرمایہ قلمی تھا۔[53]

---

[51] تاریخ ادب ۔ مرتبہ جناب رام بابو صاحب سکسینہ ...... صفحہ ۲۸۰ [52] آب بقا مؤلفہ خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی صفحہ ۱۰۵ تا ۱۱۱ [53] شعر و سخن صفحہ ۱۰۱

مفتی اسد اللہ الہ آبادی خان بہادر ابن مفتی کریم قلی علمائے زماں سے تھے مولوی رحمٰن علی تذکرہ علمائے ہند میں لکھتے ہیں :-

دانشمند ذکی ومتقی باوصاف حمیدہ واخلاق پسندیدہ آراستہ وپیراستہ بود نسبت تلمذ بہ مولانا فضل رسول بدایونی داشت ہنگامیکہ در فتح پور مفتی عدالت بود فقیر جامع الاوراق شرح عقاید نسفی ومشکوٰۃ شریف در خدمت بابرکت شان سبقاً خواندہ باز قاضی القضات صدر آگرہ ودر اخیر صدر الصدور جون پور شدہ۔

خان بہادر مفتی اسد اللہ جون پوری جس زمانہ میں آگرہ میں صدر نظامت تھا یہ قاضی القضات تھے۔ گلی نصیر خاں میں قیام تھا۔

ایک روز مولوی محمد شفیع وکیل صدر الہ آبادی قاضی صاحب کے پاس ملنے آئے اور کہنے لگے برادر زادہ میں نے اپنا مکان گلاب خانہ میں جو تعمیر کرایا ہے اس کو تو دیکھ لو اور مشورہ دو کہ کن کن باتوں کی اس میں کمی رہ گئی ہے چنانچہ مفتی صاحب دوسرے روز عدالت سے اُٹھ کر سیدھے وکیل صاحب کے گھر گئے انھوں نے چاروں طرف پھرایا اور تہ خانہ میں لے گئے اس میں ایک صندوق رکھا ہوا تھا اُس کو کھولا اور اس میں سے ایک رومال زریں نکال کر ان کے کاندھے پر ڈال دیا اور کہا میاں دیکھو

صندوق میں کیا ہے مفتی صاحب کی نظر پڑی اشرفیاں اور روپیہ بھرے
ہوئے تھے وکیل صاحب نے کہا یہ تمہارے لئے ہیں۔ فکر مندی سے مفتی
صاحب نے وکیل صاحب کا منھ دیکھا اس پر وہ بولے کہ بھتیجے آج کل جو راجہ
کا مقدمہ تمہاری عدالت میں پیش ہے اس نے یہ روپیہ میرے ذریعہ سے
تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اس کو قتل کے مقدمہ سے بری کر دو، مفتی صاحب
کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے کہا چچا میاں افسوس ہے
کہ کیا میں سُن رہا ہوں ہونا یہ چاہئے تھا کہ میں رشوت لیتا ہوا ہوتا اور
آپ مجھ کو تنبیہہ کرتے ہوئے ہوتے، اور آج خود میرے بزرگ ہو کر رشوت
پر آمادہ کر رہے ہو۔ رومال جو کندھے پر ڈالا گیا تھا وہ پھینک کر باہر آ گئے
اور اسی وقت حاکم صدر کے پاس گئے کہ راجہ کا مقدمہ میرے پاس سے
اٹھا لیا جائے، مجھ پر میرے بزرگوں کے زور ڈالے جا رہے ہیں کہ ضمیر کے
خلاف صورت اختیار کروں۔ حاکم صدر نے کہا آپ ہی یہ فیصلہ کریں گے
خیر بات آئی گئی ہوئی کچھ عرصہ بعد راجہ کا مقدمہ پیش ہوا ثبوت کمزور تھا فیصلہ
راجہ کے موافق کیا مولوی محمد شفیع وکیل نے آ کر کہا میاں اب کیوں چھوڑا۔
مفتی صاحب بولے چچا واقعات کی بنا پر فیصلہ کیا ہے اگر شہادت خلاف
ہوتی تو ویسا ہی فیصلہ کرتا۔
حضرت ببہرے اور مفتی صاحب سے بے حد تعلقات تھے خوشنابہ جگر

میں اکثر خطوط مفتی صاحب کے نام لکھے ہیں۔
یکم جمادی الاول یوم دوشنبہ سنہ ۱۲۳۰ھ کو وصال ہوا محلہ چتر ساری جون پور میں دفن ہوئے۔

مفتی محمد حسن گوپاموی جون پور میں بسلسلہ وکالت جس زمانہ میں تھے مفتی صاحب کے مزار پر روزانہ جایا کرتے تھے۔

راجہ مہاراجہ بلوان سنگھ کاشی گوتم برہمن ابن راجہ چیت سنگھ والئے بنارس مولوی اکرام اللہ مرحوم لکھتے ہیں:-

پدر راجہ از مظالم لارڈ وارن ہسٹنگز وطن را خیر باد کردہ
گوالیار آمدہ بعد ازاں در اکبرآباد طرح اقامت انداختہ[1]

گورنمنٹ برطانیہ نے بسعی جنرل لیک دو ہزار روپیہ ماہوار اُن کا وظیفہ مقرر کردیا جو بلوان سنگھ تک شمار ہا جناب راجہ علوم فارسی سے واقف تھے اس پر سخنوران اکبرآباد کی صحبت نے فکر کرنے لگے آسیر اور مہر سے مشورۂ سخن کیا صاحب دیوان آپ ہر ماہ ایک مرتبہ محفل مشاعرہ منعقد کیا کرتے۔ حضرت نجیر اور مفتی محمد انعام اللہ خان بہادر وکیل صدر سے دوستانہ تعلقات تھے۔ غدر کے بعد انتقال ہوا[1]

تو ہے وہ گل کہ نام ترا باغ دہر میں — دو دو پہر وظیفۂ مرغ سحر ہوا
اقلیم کبھی زیر نگیں رہتی تھی راجہ — اب صرف غالب نگیں پہ نہ رہیں گے
پہلو میں بیٹھ کر مرے ایکدم وہ چل دیے — سب دل ہی دل میں حوصلے دل مضطر کے رہ گئے

---

[1] تصویر الشعرا

۴۷

انشائے بیخبر
کا
دیباچہ

مذاق درد کے آشنا جو نوکِ نشتر کو تصوّرِ مژگانِ دلدار کی طرح دل میں ڈوبا رہنا عزیز رکھ کے اُس کی علیحدگی پسند نہیں کرتے لذتِ زخم کے شناسا جو آبِ شمشیر کو شربتِ دیدارِ یار کے مانند آبِ بقا سمجھ کے دہنِ تمنا بند نہیں کرتے خوب جانتے ہیں کہ جب آتشِ گل عین بہار میں آشیانے میں آگ لگائے تو بلبل نوحہ سرائی میں مجبور ہے اور جب ساقیِ بے رحم سرِ محفل صراحی کا خونِ جگر اُس کے مُنھ سے اُگلوائے تو نالۂ قلقل کا بلند ہونا ضرور ہے آبشار کا سر جب پتھر سے ٹکرائے تو پھر وہ کیونکر نہ چلّائے نے کے ناسورِ سینہ پر جب ناخن زنی ہو تو وہ کس طرح شورِ شیون نہ سُنائے بیمار کراہنے سے باز رہے اس جبر پر اُسے کب اختیار ہے جس کے دل پر چوٹ ہو اُس کی زبان فغاں نہ کرے بہت دشوار ہے جب یہاں کا یہی دستور ہے پھر بیخبر کا کیا قصور ہے اگلے فغانوں کے بعد وہ کیونکر فغاں نہ کرتا کیا چپ رہ کر

دل ہی دل میں گھُٹ کر مرتا مجموعۂ فغان بے خبر چھپنے کے بعد وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتا فغاں کرتا ہے اور ان اوراق پر اُس کی تصویر کھینچتا ہے اگر قضا نے اتنی مہلت دی کہ یہ مجموعہ بھی مجموعہ اوّل کے حد کو پہونچا تو یہ اُس کا ثانی ہوگا ورنہ یہ بھی اُسی میں شامل کر دیا جائے گا اختتام پر یہ شعر حضرت بیدل کا داخل کر دیا جائے گا۔

افسانہا بہ بستن مژگاں تمام شد
کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود

بیخبر

مولینا غلام امام شہیدؔ

قبلہ! میری شوخی دیکھئے!۔ یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معاملہ کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں۔ کہ ید بیضا کی چمک دیکھئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا۔ جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے! اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارہ سے حظ اٹھائے!۔ گونگا چاہے۔ کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے! اگرچونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور کیا کرتا ہوں۔ دیباچہ بھی لکھ ڈالا۔ وہ اُس کے قابل تو کاہے کو ہے۔ آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے۔ جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو۔ یا زربفت کے قبا میں چھینٹ کا حاشیہ لگا ہو۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نومشق لکیریں

بنادے۔ سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھا دے۔ مگر
اس نظر سے کہ ہر چیز اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بدصورت کے
مقابلہ میں حسین کے حُسن کو اور رونق ہوتی ہے۔ شب تار میں شمع کی
روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے۔ کھاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت
میں اور ہی مزا آتا ہے۔ صحرا نوردی کے بعد باغ کی سیر کا لطف کہاں نہیں
جاتا ہے۔ خاطر مشکل پسند پسند کرلے۔ تو ہو سکتا ہے۔ بیشک دیکھنے
والوں کو اس کی خوبی زیادہ دکھاوے گی۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے۔
اُسے روشنی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوش طالعی ہے۔ اگر یہ قبول ہو۔
اس کے لئے شرف ہے۔ اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اُسے
حصول ہو۔

نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب

حضرت۔ نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے
مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے
خطوط اور ان کا دیباچہ آگیا میں نے سوائے اس کے کہ آپ
سے بہت کچھ حاصل کیا کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد

سے آپ کی تحریریں فراہم کیں خود سب کو دیکھا، جو مضامین لائق اعلان
کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا کاتب لکھ رہا ہے۔ میں مقابلہ کرتا ہوں ابتک
بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں امید
ہے کہ اُدھر کا گشت کا آغاز ہو اِدھر اس مجموعہ کا انجام ہو، میں اپنے
حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لئے ان کے حوالہ کروں اس وقت
بھی مقابلہ میں مصروف ہوں پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا
کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ منشی حبیب اللہ صاحب ذکا۔ میاں
داد خاں صاحب سیّاح۔ ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور
ہوں گے آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے
پاس بھیج دیں رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے شاید وہاں سے بھی کچھ
آجائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اس میں
شامل ہوں غنیمت ہے!!

دیگر

جناب عالی۔ میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے
اس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری
نے جو رسالہ (مؤید برہان) تصنیف کیا ہے (قاطع برہان) کے

جواب میں) اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے آج تک جواب نہیں کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترک جواب حضرت کی عادت نہ ہو، جواب عنایت کیجیے مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے الحمد للہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی جلد بند ہوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی اب چھپوا لے ہیں دیر کریں یا جلد ہی انھیں اختیار ہے

نجیبر

نواب غلام دستگیر خاں حیدرآبادی

اللہ اللہ ایسے نا پرسی اور نا قدری کے زمانے میں کہ آفتاب کو ذرہ دریا کو قطرہ گل کو خار اکسیر کو خاک جواہرات کو پتھر موتی کو سیپ سونے کو تانبا چاندی کو پارہ چاند کو تارہ کے برابر بھی لوگ نہیں جانتے ایسے جوہر شناس اور قدر دان بھی ہیں جو ذرہ کو آفتاب قطرہ کو دریا خار کو گل خاک کو اکسیر پتھر کو جوہر سیپ کو گوہر تانبا کو سونا پارہ کو چاندی تارہ کو چاند کے مساوی مانتے ہیں سچ ہے ایسے ہی لوگوں سے زمانہ قائم ہے۔ آپ میری اور میری تصنیف کی تعریف فرماتے ہیں اور میں خجالت سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں حیرت کے دریا میں ڈوبا جاتا ہوں کہ میری اس ہیچمدانی پر تو یہ افراط

قدر دانی ہے اگر بفرض محال مجھے کچھ آتا ہوتا تو کیا ہوتا آپ اپنی کثرتِ عنایت
سے جو چاہیں فرمائیں میں تو اپنے کو ہیچ سے نسبت دیتے ہوئے بھی شرماتا ہوں
اور ڈھونڈھتا ہوں کہ کوئی ایسا لفظ ملے جو ہیچ سے بھی زیادہ ہیچ ہو تو اس سے
اپنے کو تعبیر کروں یہ کیا ارشاد ہوا کہ تم جو اپنے کو فقیر لکھتے ہو اُس کو میں تعلّی
سمجھتا ہوں۔ اس لفظ سے زیادہ تو کوئی انکسار کا لفظ نہیں ہے پھر اس سے
تعلّی کیونکر مفہوم ہوتی ہے غالباً الفقر فخری کی طرف خیال جاتا ہوگا وہ اور
مقام ہے مجازاً فقیر مفلس اور نادار کو کہتے ہیں میں اسی معنی میں اپنے کو فقیر لکھا کرتا
ہوں نہ اُس معنی پر اس سے زیادہ ناداری کیا ہوگی کہ یہاں کی کوئی چیز اپنی
نہیں سب عاریتی ہیں چند روز جو اس مُسافر خانہ میں ٹھہرا ہوں میرے پاس ہیں
یہاں سے چلا جاؤں گا کسی اور کو مل جائے گی یہاں سے جہاں جاؤں گا
وہاں کے لئے کچھ سرمایہ پاس نہیں محض تہیدست پھر مجھ سے زیادہ مفلس کون
ہوگا اور کیوں اپنے کو فقیر نہ کہوں جن عنایت فرماؤں نے فغانِ بیخبر کو لوگوں کے
کانوں تک پہونچایا تھا اب انھوں نے نوشتۂ جگر کو رنگ طبع دیا جو میرے
فارسی نظم و نثر کے مجموعہ کا نام ہے چونکہ ہفتہ عشرہ میں تمام ہو جانے والا تھا
میں نے عنایت صحیفہ کے جواب عرض کرنے میں اُس کے تمام ہونیکا انتظار
کیا چنانچہ وہ اختتام کو پہونچا اور آج اس کی ایک جلد خدمت عالی میں روانہ
کی کہ میری نادانی کے دو گواہ آپ کے حضور میں پہونچیں اور اُس کی

تصدیق کامل ہو جائے ایک کی سیر سے تو آپ تقفیع اوقات کر چکے اب اس کو ملاحظہ فرما کر یہ زبان پر آئے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

مولوی محمد روح اللہ منصف بسولی

اتنی مدت میں ملا مجھ سے وہ دھوکھا دے کر
یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

اللہ اکبر اتنی مدت میں آپ نے مجھے یاد کیا کہ میں اس راہ و رسم ہی کو بھول گیا تھا خط جو آیا تو دیر تک حیرت زدہ اُسے دیکھتا رہا کہ کس کا خط ہے اور کاتب اس کے کون بزرگ ہیں جب کچھ خیال میں نہ آیا تو فہرست اسماء احباب میں جو صفحۂ دل پر لکھی ہوئی ہے دیکھنے لگا دیکھتے دیکھتے آپ کا اسم گرامی نکلا اُس کے پڑھنے نے دل کے ساتھ وہ کام کیا جو اعجاز عیسیٰ مردہ کے ساتھ کرتا تھا ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ آپ کا خط ہے عقل نے کہا خدا خیر کرے اُنھوں نے کبھی اور بھی لکھا ہے کہ اب لکھتے کئی دفعہ ردّ و بدل کرنے کے بعد میں نے خط کھول ڈالا جب کھولا تو یہ کھلا کہ آپ ہی بر سر لطف و احسان آئے ہیں اب تک سوچتا تھا کہ شکریہ کیسے لکھوں آپ کو جنھوں

نے ایک عمر کے بعد یاد فرمایا یا فرزند دلبند حافظ خواجہ احمد حسین کو جو باعث اس یاد آوری کا ہوا آخر رائے نے اس پر قرار پکڑی کہ بچوں سے شکر گذاری ہی کیا آپ ہی کا سپاس ادا کروں کہ وہ آئندہ کے لئے بھی کام آئے گا یاد آوری کے استحقاق کی بنا کو قائم کرے گا جو نعمت ایک عمر کے بعد ملے اس کے شکر ادا کرنے کو بھی ایک عمر چاہئے وہ کہاں سے ہاتھ آئے اس لئے اعتراف عجز سے اس مرحلہ کو طے کرتا ہوں در حقیقت میں اس کا ممنون ہوں کہ میری جگہ آپ کے دل میں تھی جو آخر کار اس نے مجھے یاد دلایا اگر نہ ہوتی تو کیوں یاد آتا فرزند عزیز کے وہاں جانے سے جہاں آپ ہیں مجھے بڑی تقویت ہوئی یقین ہے کہ آپ کسی طرح مجھ سے کم اس کے ساتھ محبت نہ کریں گے خدا کرے اب آپ مجھے بھول نہ جائیں اور کبھی کبھی تو یاد فرمائیں۔

مولوی ولی محمد وکیل منصفی شاہ آباد

از حال دل ندانم آگہ کہ کرد او را
من خود نہ رفتم آنجا فریاد رفتہ باشد

فریاد رس حقیقی کا شکر ہے کہ فغانِ بیجگر کی خبر آپ تک پہونچی اور

اُس کے سُننے اور خوننابہ جگر کے رنگ دیکھنے کا آپ کو ایسا شوق ہوا کہ ایک عمر کے بھولے ہوؤں کو آپ نے یاد کیا میں تو جانتا تھا ؎

کون سنتا ہے فغانِ بیخبر
دیکھتا ہے کون خونناب جگر

مگر معلوم ہوا کہ نہیں ابھی گوش شنوا اور دیدۂ بینا باقی ہیں کل ایک ایک نسخہ دونوں کا روانہ کیا ہے صرف پہنچ جانے کی اطلاع چاہتا ہوں اس غرض سے کہ ڈاک میں تلف ہونے کا کھٹکا دل سے جاتا رہے۔

منشی امین الدین خاں

لطف فرما میرے الطاف نامہ کے پہونچنے نے مجھ کو ممنون افراط محبت اور دل کو سرشار بادۂ مسرت کیا آپ نے جو ایک قطعہ کے معنی پوچھے ہیں پہلے یہ سن لیجئے کہ تصوف کے جاننے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جنھوں نے اس علم کی کتابیں دیکھی ہیں۔ صوفیوں کی صحبت میں رہے ہیں اُس کے مصطلحات اور محاورات اور نکات اور دقائق سے ظاہری واقفیت رکھتے ہیں لیکن اُن کا باطن اُس کی کیفیت سے کیف نہیں ہوتا یہ اگر کچھ بیان کریں تو بقدر اپنی معلومات کے بیان کر سکتے ہیں گو وہ چنداں بے ٹھور ٹھکانے نہ ہو مگر

غلطی سے پاک بھی نہ ہوگا اور عالم بے عمل کے وعظ کی طرح اُن کے
بیان میں اثر اور کیفیت نہ ہوگی دوسرے وہ ہیں جن کے باطن کو اُس سے
تعلق ہے اس مسلک کے سالک اور اس منزل کے واصل ہیں اُنکا
کیا کہنا وہ جو لفظ مُنھ سے نکالیں گے گوہر تحقیق ہوگا جو حرف زبان
پر لائیں گے ایک دفتر معارف اور تدقیق ہوگا اُن کے صرف بیان
میں وہ اثر ہوگا کہ سُننے والے مدہوش ہو جائیں ہر چند علم ظاہری نہ رکھتے
ہوں اُن کا حال مولائے معنوی کے اس قال کا مصداق ہوگا ؎

گر کُنی خدمت نخوانی یک کتیب
علم ہائے نادرہ یابی ز جیب

فرقۂ اوّل کا کہنا نرا قال ہے اور دوسرے فرقہ کا سراسر حال
وہ پُرانی کہانی کہتے ہیں یہ اپنی سرگذشت بیان کرتے ہیں اہل مذاق اسکو
سمجھتے ہیں کہ دونوں میں کتنا فرق ہے ایک تیسرا گروہ اور ہے ان دونوں
سے علیٰحدہ وہ وہ ہیں جن کو نہ اس علم سے ظاہری تعلق ہے نہ باطنی،
اس کی بعض باتیں کہیں سُن لی ہیں یا کہیں کوئی مضمون شعر میں دیکھ لیا ہے
مقلّدانہ کبھی کچھ کہہ اُٹھے یا شعر میں باندھ بیٹھے نہ اُن کا بیان ٹھیک ہوگا
نہ کلام باقاعدہ اس قطعہ میں جس کو آپ پوچھتے ہیں ؎

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی عجب گردشِ پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

عجب خلط مبحث ہے پہلے شعر کا تو یہ مطلب ہے کہ سلوک میں جب جیسی واردات طاری ہو تو ویسا برتاؤ برتے کیفیتِ سُکر میں ہو تو میکدۂ بیخودی میں سر پائے خم پر رکھدے اور حالتِ صحو میں ہو تو مناجات کرنے کو رو بہ سوئے قبلہ ہو بیٹھے یہ متعلق بسالک ہے اور دوسرے شعر کے یہ معنی ہیں کہ تغیرِ صفات میں بھی ناظر جلوۂ ذات رہے تشبیہ جو نقاب اور حجاب تشابہ تنزیہ ہے اُسے نظارۂ ذات سے مانع نہ ہو ہر صورت میں وہی حسن ہر ذرّہ میں وہی چمک دیکھئے زبانِ حال سے یہ پکارے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ درپوش
کہ من آں جلوۂ قدمی شناسم

اور یہ متعلق بہ عارف ہے پہلے شعر کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے کچھ تعلق نہیں اور تقریر کے مساعد نہ ہونے سے مطلب کا خبط ہو جانا مزید براں دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی بندش نے اور بھی معنی کو ژولیدہ کر دیا ہے اُسے جو یوں کہا ہے۔ یعنی عجب گردشِ پیمانۂ صفات۔ یوں کہنا تھا "پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو" دونوں شعروں کو باہم ربط تو اس سے بھی نہ ہوتا مگر دوسرے شعر کے معنی صاف ہو جاتے مقلدانہ اور لاعلمانہ کلام اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اُس کی شرح میں

فکر کرے غور و خوض کے لائق محققین کا کلام ہوتا ہے یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شاعر ہو وہ صوفی بھی ہو۔

---

۸ محسن الدولہ محسن الملک نواب مہدی علی خاں بہادر منیر نواز جنگ

مخدوم دو چار ہی دن ہوئے کہ میں نے کچھ اپنے تردوات کے بیان میں ایک خط آپ کو لکھا تھا کل برخوردار خواجہ محمد جان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ پر بھی ان دنوں اپنے والد ماجد کے انتقال کا سخت حادثہ گذرا تعجب ہے کہ ممتاز علی خاں صاحب نے مجھے نہ لکھا مجھے بھی اس واقعہ کا نہایت رنج ہوا آپ کو جس قدر ہو کم ہے اس میں شک نہیں کہ والدین کا سایہ ظل ہما سے بڑھ کر ہے مگر جب دنیا خود ہی سایہ کی طرح گذران ہو تو اُس کی کس کس بات کا رنج کیا جائے اُن کے خوش قسمت ہونے میں کچھ شک نہیں جتنے دنوں جئے عزت و آبرو عیش و آرام میں بسر کی مرے تو آپ سا یادگار چھوڑا کہ جو فخر خاندان بلکہ فخر ہندوستان ہے خدا اُن کو مغفرت

کرے اور آپ کو صبر و استقامت عطا فرمائے اور آپ سے اُن کے نام کو روشن رکھے۔

مولوی محمد حامد

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

اس وقت آپ کے اشتیاق نامے نے مجھے سخت متحیر کیا اللہ اکبر یہ اشتیاق کہ ایک عرصہ سے اُس کا ہونا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ گریز کہ ایک شہر میں رہکر ملنا تو درکنار یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا حال مجھ پر ظاہر ہو خدا خدا کیجئے یہ بھی کوئی بات ہے آیئے اور ملئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کا اشتیاق سچا نہیں ہے ذوق کے اس شعر کے معنی جو آپ پوچھتے ہیں ؎

ہیں آئینہ میں صورت تصویر آئینہ   آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

یہاں صورت کے معنی لغوی یعنی نقش اور پیکر یا مجازی یعنی چہرہ اور عکس مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اصطلاحی سے مراد ہے یعنی طرح اور کیفیت اور حالت اور وضع اور مثل وغیرہ صورت کو ان معنوں میں اساتذہ عجم نے بھی مستعمل کیا ہے چنانچہ خسرو لکھتا ہے ؎

من چو دیدم صورتت رفتم ز دست
دیگراں را تا چہ صورت داد دست

اسے تا چہ حالت قبول ؂

چو دید ابروانِ ترا گفت مانی   کشیدن کمانِ تو صورت ندارد

یعنی امکان ندارد قدسی ؂

قضا ز پایۂ قدرِ تو صورتے برداشت   زمانہ نام نہادش سپہر کیوانی

یعنی طرح برداشت اور اُردو میں اصطلاحی معنی میں یہ لفظ بہت کثرت سے آیا ہے مثلاً کسی صورت سے یہاں لے آؤ کوئی صورت ملنے کی بتاؤ آسمان کی صورت گردش میں ہے مُردہ کی صورت پڑا ہوا تھا علیٰ ہٰذا القیاس۔ اس شعر میں صورت بمعنی مثل ہے اور لفظ میں آئینہ سے متعلق نہیں ہے یعنی یہ غرض نہیں ہے کہ آئینہ میں ہیں بلکہ آخر شعر میں جو لفظ ہم ہے اُس سے متعلق ہے یعنی ہم ہیں اور تصویر آئینہ سے مقصود وہ تصویر نہیں ہے جو آئینہ کے پیچھے کے تختہ یا ٹین پر بنی ہوتی ہے جیسا کہ آپ سے نکلنے والے صاحب کا قول ہے اُس کو تو تصویر پشت آئینہ کہتے ہیں اور نہ اُس سے مراد ہے جو کاغذ وغیرہ پر کھینچ کر آئینہ کے نیچے رکھ دیتے ہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں اُس تصویر کو تصویر آئینہ نہیں کہتے بلکہ اُس آئینہ کو جو تصویر کے اوپر ہو آئینہ تصویر نما یا آئینہ تمثال دار کہتے ہیں۔ تصویر آئینہ وہی تصویر ہے جو سطح آئینہ پر کھچی ہوتی ہے

مطلب شعر کا یہ ہے کہ جسطرح تصویر تصویر آئینہ آئینہ کے اندر متحیر ہوتی ہے جو اُس کے سکوت سے ثابت ہے اُسی طرح اُس آئینہ رُو کے سامنے ہم حیران ہیں یعنی حیرت میں ہیں اور آئینہ کے ساتھ صورت اور تصویر اور رَو اور حیرانی اِن الفاظ مناسب کا لانا شاعر کا حُسن بیان ہے اور اگر مذاق تصوّف کے موافق اس کے معنی کیجئے تو شاعر نے مقام قرب کو بیان کیا ہے اور وہ مقام مستلزم حیرت ہے اور معشوق کو آئینہ رو کہتے ہیں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ جب کوئی آئینہ کے سامنے ہو تو اُسے اُس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے عاشق کو جب مرتبہ قرب کا حاصل ہوتا ہے تو دوئی کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس کو حضرت مرزا بیدل نے فرمایا ہے ؎

شب کہ آئینہ آں آئینہ رو گردیدم
جلوہ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اور حیرت چھا جاتی ہے اور یوں کہئے کہ من تو شدم یا تو من شدی مضمون وا حد ہے ہاں صاحب آپ نے یہ القاب ہادی مراحل خداشناسی جامع علوم ظاہری و باطنی مجھے کیسا لکھا مجھے اس القاب سے کیا مناسبت میری صورت میری وضع میری معاشرت میری حالت سب اس کے خلاف خدا شناسی اسی کا نام ہے جو میرا حال ہے تو بقول حضرت مولوی معنوی۔

گر ولی این است لعنت بر ولی

آیندہ ایسے القاب سے معاف کیا جاؤں اگر رندِلا اوبالی گرفتار ہوا و ہوس حریص دنیا وغیرہ لکھئے تو مناسب حال ہے۔

حکیم محمد شفیع صفی پوری

جی حضرت عید ملنے آیا ہوں اُٹھئے اور ملئے ؎

سخت میخواہم کہ در آغوش تنگ آرم ترا
ہر قدر بفشرد دل را بفشارم ترا

آپ فرمائیں گے کہ عید پیچھے ٹرکیسی یہ بات نہیں ہے عید کی نماز یعنی رمضان شریف کے بخیر سدھارنے کا صلوٰۃ الحمد پڑھ کے جو پڑا تو ضعف صوم سے کئی دن بے ہوش پڑا رہا پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا بہت جلدی کی دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج پہنچا ورنہ اپنا تو ناتوانی سے بقول یادش بخیر بخیر یہ حال ہے ؎

در اولِ بہار روم گر بسوئے باغ   از ضعف تارسم بدرِ آں خزاں رسد

خیر یہ باتیں تو جانے دیجئے ستو یاں منگوائیے یا اسے بھی افطاری کی طرح ٹالئے گا معلوم ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے آپ کو ٹالنا خوب آتا ہے،

لائے عطر و پان ہی عنایت کیجئے میں اب رخصت ہوتا ہوں آپ سے تو یہ بھی امید نہیں ہے کہ بازدید کو تشریف لائیے گا۔ آپ کو ر اجاؤں سے کہاں فرصت ملتی ہے کہ غریبوں کی طرف توجہ فرمائیگا۔

صحب

خدا کے فضل سے یوسف تھا تو ہو صاحب
اب اور چاہیے کیا ہو پیمبری ہو جائے

خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمھیں محبوب صورت مرغوب سیرت حسن شمائل پسندیدہ خصائل فہم رسا ذہن و ذکا عقل سلیم طبیعت مستقیم علم مفید بخت سعید تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت اخلاق تام قبولیت عام شوکت ثروت قدرت حکومت نیک نامی کا شہرہ شاد کامی کا بہرہ عزت کی دولت دولت کی عزت سب کچھ دیا ہے سویدا کی صورت جگہ ہر ایک دل میں ہے نور کی طرح مقام آنکھوں کے تل میں ہے جسے دیکھو دامن کی وضع پاؤں پر سر جھکائے ہوئے جس پر نظر کرو رکاب کی مثال قدم آنکھوں سے لگائے ہوئے خواص کو یہ تمنا کہ طرہ کے مانند سر پر چڑھ جائے عوام کی یہ خواہش کہ خاک راہگذار کی شکل سواری کے نیچے پس جائے عطر کے مشابہ جس بزم میں آئے

مہک اُٹھے آفتاب کے مثال جس طرف رُخ کیا چمک اُٹھے جس مکان میں تم نہیں وہ چمنِ بے لالہ و گُل ہے جو محفل تم سے خالی ہو وہ انجمن بے شمع و گُل ہے اور اُسی طرح ذکر تمھارا از بانوں پر جاری خون کے ہر رنگ محبت تمھاری رگِ جاں میں ساری کانوں کو تمھاری آواز کی وہ آرزو جو قلقلِ مینا کی میخواروں کو یا اذانِ صبح کی شب بیداروں کو آنکھوں کو تمھارے دیدار کی وہ جستجو جو لقائے خوباں کی عاشق مزاجوں کو یا عید کے چاند کی روزہ داروں کو رُعب کی یہ حالت کہ ایک گردشِ چشم میں لوگوں کے دل دانۂ اشک کی طرح پس جاتے ہیں تالیف کی یہ کیفیت کہ شرح محامد میں خلائق کے قلم گھس جاتے ہیں پھر اب اور کیا چاہتے ہو کونسی بات نہیں ہے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمھاری کوشش تحصیل حاصل میں ناسپاسی کی حد کو نہ پہونچ جائے انسان ہوس کو جتنا بڑھائے بڑھتی ہے شاہنشاہی ہونے کے بعد بھی یہ بس نہیں کرتی ہے میری یہ دعا ہے کہ جہاں خدا نے تمھیں سب کچھ دیا ہے وہاں قناعت کی دولت بھی عطا کرے۔

اے قناعت تونگرم گرداں
کہ ورائے تو ہیچ دولت نیست

مولوی امیرالدین احمد الہ آبادی آنریری مجسٹریٹ

مکرمی میر افغاں جو اپنی نارسائی سے میرے کان تک بھی نہ پہنچتا
تھا آپ کی عنایت سے تمام زمانے کے گوش زد ہوا میرا خونابہ جگر جسکو نارسائی
سے میرے دامن کے سوا کسی نے نہ دیکھا تھا آپ کی توجہ سے ایک عالم کا
روشناس بنا میرا دلِ غم دوست کبھی فغاں کرنے سے باز نہیں آتا اور میرے
ناسور جگر سے ہمیشہ خونابہ ٹپکا کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب بھی جو فغاں
لب سے نکلے آپ کے کان تک پہونچے اور جو خون جگر سے آپکی نظر سے
گذرے یہ خواہش بھی میرے دل میں آپ کی قدردانی کی نظر سے پیدا ہوئی
قاعدہ ہے کہ جو دلجوئی کرے اُسی سے دردِ دل کہنے کو جی چاہتا ہے اور
جو آستین شفقت سے آنسو پونچھے اُسی کے آگے زیادہ رونا آتا ہے ورنہ
میں نے کبھی ایسی تمناؤں کو دل میں آنے نہیں دیا ہے اور اس سودا سے
ہمیشہ میرا دماغ خالی رہا ہے اس وقت تک جو کچھ اردو فارسی نظم و نثر جمع
ہوئے اُن کو ایک مجلد میں لکھوا کر آپ کی خدمت میں نذر کرتا ہوں آیندہ
بھی جو کچھ اس میں درج کرنے کے قابل ہوگا بھیجتا رہوں گا۔

مولوی محمد حامد[۴]

میں اس خط کے عنوان کو القاب سے خالی رکھتا ہوں اس لئے کہ القاب مکتوب الیہ کی شان کے موافق لکھا جاتا ہے اور جب اُن سے محض لاعلمی ہو تو کیا لکھا جائے اور آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی شان کے لائق لکھ لیں اس محبت غائبانہ کا کیا شکر ادا کروں کہ آپ کو میری خیریت کی طرف تعلق خاطر ہے اور آپ نے اس کو مجھ سے دریافت کیا الحمد للہ ہر حال میں خوش حال ہوں اور گوشۂ عافیت میں زندگی کی میعاد پوری کر رہا ہوں قصہ کہانیوں میں سُنا کرتا تھا کہ اس قسم کے دوست بھی ہوتے ہیں کہ محبت رکھتے ہیں اور نظر نہیں آتے تو استعجاب ہوتا تھا جب سے یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ دل سے تو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور آنکھوں سے میری چھپے رہتے ہیں تب سے وہ تعجب جاتا رہا اب یہ دُعا ہے کہ خالق جن و انس آپ کے دل میں میری محبت کو اتنی بڑھائے کہ وہ ایک دن کھینچ کر آپ کو میری آنکھوں کے سامنے لا دے۔

خواجہ غلام نبی[۱۷]

برادر عزیز از جان جنت نصیب مُغل صاحب مرحوم کا ایسا حادثہ

ہے کہ اگر کہوں قیامت آگئی یا آسمان ٹوٹ پڑا یا زمین پھٹ گئی یا دنیا اُجڑ گئی تو بھی کم ہے کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس کی تعبیر کروں اور کہوں کہ کیا ہوا ایسی مصیبت میں کہ اگر پہاڑ پر پڑے تو وہ بھی پاش پاش ہو جائے کس دل اور زبان سے تمھیں کہوں کہ صبر کرو۔ صبر کی بھی ایک غایت ہوتی ہے یہ تو اُس سے کہیں بڑھا ہوا ہے یہ وہ واقعہ ہے کہ صبر خود بے صبر ہو نہ زبان کچھ کہہ سکتی ہے نہ قلم کچھ لکھ سکتا ہے دل فولاد کا کلیجہ پتھر کا کروں تو بھی کچھ لکھا نہ جائے پھر کیا لکھوں اب یہ کہتا ہوں کہ جس خدا نے یہ مصیبت ڈالی ہے وہی صبر بھی دے۔

مُحِب

از نالۂ دلِ ما تا کے رسیدہ رفتن
زیں درد مناہ حیف با پاے شنیدہ رفتن

میں نے سُنا کہ آپ یہاں سے تشریف لے جانے والے ہیں اور صبر میرے دل سے طاقت میرے جسم سے روشنی میری آنکھوں سے فرحت میری طبیعت سے سکون میرے حوصلے سے رخصت ہو کر آپ کی ہمراہی کا ارادہ رکھتے ہیں ایک تو آپ کا سدھارنا دوسرے اتنے رفقائے قدیم کا جدا ہونا

جو قیامت میرے سر پر لائے گا وہ ظاہر ہے مگر کیا کیجئے نہ آپ کو روکنے
کی قدرت ہے اور نہ اُن سبھوں کو منع کرنے کی طاقت یوں تو بسر نہ ہوگی
اور اجل کے نازِ معشوقانہ الگ ہی جان لینے والے ہیں جب تک اُس کا جی
نہ چاہے گا وہ آئے گی نہیں اس لئے میں نے بھی تنہائی اور بے لبسی اور بیکسی
اور درد اور گریہ اور بیقراری کو بلانے کا ارادہ کر لیا ہے یہ سب ایسے سراپا
اخلاق ہیں کہ جھوٹوں یاد کیجئے تو سچوں دوڑے چلے آتے ہیں اور میرے ساتھ
تو بالخصوص انہیں جیسی محبت ہے وہ کاہے کو کسو کو کسی سے ہوتی ہے انہیں
سے جی بہلاؤں گا اور انہیں کے ساتھ بسر کروں گا آپ سے اتنی استدعا
ہے کہ مجھ سے مل کے دو باتیں میری سُن کے جائیے گا۔

---

١٦ منشی ولایت علی خاں

مخدوم آپ کی عیادت فرمانے نے مجھے ممنون ہی نہیں کیا بلکہ اتنا
مسرور ہوں میں اچھا ہو گیا اب بفضلہ بالکل تندرست ہوں یہاں تک
کہ پندرہویں رمضان شریف سے روزے اور تراویح بھی شروع کر دی ہے
آپ کی ان غائبانہ عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کا قصد تو جب کرتا کہ ممکن ہوتا
محال ہے اس لئے اُس کی مجال نہیں۔

منشی ولایت علی خاں

مخدوم حکیم صاحب کی تحریر سے مجھے آپ پر اُس صدمہ کا پہونچنا معلوم ہوا جس کو سن کے میرا دل لرز گیا انسان اگر ایک پھول کا درخت لگاتا ہے تو اُس کے پھول کا زمین پر گرنا ناگوار گذرتا ہے جب نور بصر اشکوں کے قطرہ کی طرح دامن صحرا پر گرے لخت جگر اُمید کے مانند خاک میں ملے جس چاند سی دُنیا آنکھوں میں روشن ہو وہ چھپ جائے جس نخل مراد سے گھر گلشن ہو وہ صرصر خزاں سے خشک نظر آئے جس کا نام سو دُعاؤں کے ساتھ لیتے ہوں اُس کے نام کے ساتھ ہزاروں نالہ و فغاں کا ہجوم ہو جس کی درازی عمر کی اُمید پہ باوجود زندگی سے نفرت ہونے کے جیتے ہوں اُس کے فراق میں بن آئے مر جانے کی دھوم ہو تو پھر اگر سینہ گریبان سے پہلے چاک ہو دل و جگر کا قصہ بغیر دشنہ اور خنجر کے پاک ہو حیرت سے اشک خون کے مثال سوکھ جائے سکتہ سے آہ و آہ بھول کے لب تک نہ آئے پھانسی کی طرح گریبان گلوگیر ہو دامن کی وہ دھجیاں اُڑیں جو ایک اُن میں سے پاؤں کے لئے زنجیر ہو اندھیری رات میں روشنی ہو تو اپنی آہ سوزاں سے روز سیاہ میں نور ہو تو اپنے داغ سینہ بریاں سے خشک لب تر ہوں تو اپنے آنکھوں کے پانی سے گوش آشنا ہوں تو اپنے ہی غم کی کہانی سے وصال یار سے زیادہ موت کا انتظار ہو مال و متاع

دُنیا سے صرف کفن درکار ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں آپ اپنے فرزند کے انتقال سے ان حالتوں کے مصداق ہوں اور میں لکھوں کہ صبر کیجئے کیوں کر لکھوں خود غم و درد کا مبتلا ہو کر ایسی بیدردی کروں یہ مجھ سے نہ ہوگا اتنا البتہ کہتا ہوں کہ آپ صوفی مشرب بھی ہیں تصحیح خیال ایسے ہی وقتوں میں کام آتی ہے ہجوم غم میں حقیقت ہی پر غور کرنے سے طبیعت تسکین پاتی ہے اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اسی میں مصروف رکھے اور اضطراب اور اضطرار سے بچائے۔

مولوی وکیل احمد مددگار صدر عدالت گلبرگہ

مرا دو حرف زدن با تو مشکل افتاد است
کہ من علیلم و پہلوئے من دل افتاد است

مریض کو مرض کا زمانہ بسر کرنا ہی دشوار ہوتا ہے چہ جائیکہ خود بیمار اور دوسرے بیمار کا تیماردار ہو جیسا کہ میں اس شعر کا مصداق ہوں مگر سچ یہ ہے کہ کام آپ کا خالی کوئی حکمت سے نہ پایا امراض بنائے تو مسیحا کو بنایا۔ اس ناچاقی مزاج میں کہ ایک مہینہ سے تحریک نزلہ اور شدت صرفہ نے جینا دشوار اور زندگی سے بیزار کر دیا ہے آپ کے الطاف صحیفہ کا نزول آنکھ

دیوان اور مثنویوں کا وصول و واخانۂ غیب سے
نسخۂ شفا کا عنایت ہونا ہے اس تفاؤل نیک سے امید ہے
کہ صحت جسمانی جلد حاصل اور اُن کے مطالعہ سے مرض روحانی بھی زائل
میری اُستادی پر تو زمانہ کو فخر کیا ہوتا کہ اس کی قابلیت ہی نہیں رکھتا اس
فخر پر البتہ مجھے ناز ہے کہ اس بانگ دہل نے مجھے آپ کی مخاطبت اور
نعماء غیر مترقبہ کی عنایت کے قابل کیا اس کا شکریہ مجھ سے صحت میں بھی
ادا نہ ہوتا اس بیماری میں کب ادا ہو سکتا ہے مجبورانہ سکوت اختیار اور یہ
گوش گزار کرتا ہوں۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

---

(۹)

محب

تلافی ہمہ بے مہری و جفائے شما
بہ یک نگاہ ادا شد زہے ادائے شما

محبت نامہ کے پہنچنے نے ساری شکایتوں کو دل سے دھو ڈالا
کیوں کر ایسا نہ ہوتا میں طفیلی سلام کا مشتاق تھا آپ نے براہ راست مجھی کو خط لکھا، جو
ایک پھول ڈھونڈھتا ہو وہ چمن میں پہنچے جس کی آنکھیں پیرہن کے انتظار
میں سفید ہوئی ہوں وہ یوسف کو دیکھے ذرہ کے طالب کو خورشید جلوہ

دکھائے قطرہ کے آرزومند کے سامنے دریا لہرائے بلور کے تلاشی کو
الماس ملے روپئے کے محتاج کے واسطے خزانے کا دروازہ کھلے طبیب
کو بلائیں اور مسیحا آئے دوا منگائیں اور شفا مل جائے صدف کا متمنی
صاحب دُرِشاہوار ہو پیسے کا حاجتمند مالک تخت زرنگار ہو جو روزن
دیوار سے دیکھ لینے کو غنیمت سمجھے اُس کے سامنے معشوق بے حجاب ہو جو
نکہت زلف کے اشتیاق میں بادِ صبا کا منتظر رہے اُس کے ہاتھ میں کاکل
پرپیچ وتاب ہو جو بند قبا تک ہاتھوں کی رسائی کو طالع کی رسائی سمجھتا ہو وہ
بند قبا کھولے جو دعا سے زیادہ گدائی کا اشتیاق رکھتا ہو محبوب اُس سے
مہربان ہو کے بولے جو دروازہ تک پہنچنا معراج جانتا ہو وہ محفل دلدار میں
بُلایا جائے جو دور کھڑے رہنے کو بخت کی بلندی تصور کرتا ہو وہ پہلو میں
بٹھایا جائے تو اُسے شادیِ مرگ ہونا ضرور ہے وہ تو کہئے کہ کبھی ناکامی بھی
کامیابی کی ذریعہ ہوتی ہے کبھی محرومی بھی مطلب تک پہونچاتی ہے سخت جانی
جو اس درجہ تک پہونچی تھی کہ اُس نے غمِ فراق سے مرنے نہ دیا تھا اُس نے
اس خوشی میں شادی کی موت سے بچا لیا ایک عمر کے بعد خدا نے یہ دن
دکھائے کہ جس زبان پر ہمیشہ قسمت کی شکایت کی تکرار تھی وہ آج اُس کی
شکر گزار ہے الٰہی آئندہ بھی مجھے یہ خوش وقتی نصیب رہے کہ یار کے
استغنا سے دُور رہوں اُس کا التفات مجھ سے قریب رہے۔

حافظ محمد زکریا خاں زکی

مخدوم آج تیسرا چوتھا دن ہے کہ صبح کو جو خواب سے بیدار ہوا تو ایک ایسی خوشی دل پر چھائی کہ آنکھ کیا کھلی گویا درِ نشاط کھل گیا دیکھتا ہوں تو در و دیوار پر کچھ اور ہی چمک دمک ہے زمین و آسمان پر عجیب طرح کے نور کی جھلک ہے صبح کے دلبر صبیح صورت کی صورت پر کچھ اور ہی جلوہ ہے شاید آفتاب کا اور دنوں سے زیادہ نور افشاں چہرہ ہے مجھے حیرت ہوئی اور آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا کہ الٰہی ہے کیا سحر عید ہے یا صبح نو بہار ہے روز نوروز ہے جو ایسی مسرت نمودار ہے اس کے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ یہ سب سہی مگر میرے غمزدہ دل کو خوشی سے کیا سروکار کبھی سنا ہے کہ ماتم سرا میں ہنسی آئے روتا ہوا باتوں سے بہل جائے اس کا غم تو خوشی میں اور بڑھتا ہے عید اس کے لئے محرم ہے بہار اس کی آنکھوں میں خزاں نوروز ہر روز سے زیادہ غم اندوز ہے ہنساؤ تو اسے رونا آتا ہے بہلاؤ تو اور بھی مچل جاتا ہے اس کے حق میں صبح ایک اژدہا ہے خونخوار جو مشرق کی غار سے نکل کر آفتاب کا کنچہ پھیلائے ہوئے چلا آتا ہے۔ شام ایک دیو ستمگار ہے جو مغرب کے کوہ قاف سے سر اٹھائے ہاتھ پھیلائے آکر دبائے ڈالتا ہے اسی حیرت میں تھا کہ ڈاک کے ہرکارہ نے آپکا دیوان

لا کر دیا پہلے جو چھپنے کا ذکر آپ نے کبھی لکھا نہ تھا دفعتاً اُس کا پہونچنا نعمت غیر مترقبہ ہوا اب سمجھا کہ یہ تمام جوش نشاط اور ہجوم انبساط اُس کی آمد کا تھا کیوں کر نہ ہوتا ایک دولت کسی کے ہاتھ آئے تو جامے میں نہیں سماتا مجھے تو اس ایک چیز کے ملنے سے دو دولت ملی ایک سخن کی دولت دوسرے آپ سے ہمکلامی کی پھر مجھے جتنی فرحت ہو کم ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

آپ کے دیوان کی تعریف آپ کو لکھنی یوسف کو آئینہ دکھانا ہے ۔ اور خورشید کو نور کا قصّہ سنانا ہے لیکن اتنا لکھے بغیر تو رہا نہیں جاتا کہ سلاست زبان حُسن بیان فراوانی فصاحت بے پایانی بلاغت دل نشینی معنی رنگینی الفاظ جدّت مضامین نازکی خیال والائی تلاش انگیز ادا بلندی فکر رسائی ذہن ، استخوان بندی ترکیب بدائع صنائع کیا ہے جو اس میں نہیں ہے خدا آپ کو درازی عمر میں رشک افزائے خضر و الیاس کرے کہ ایسے دیوان اور بہت سے تصنیف ہوں میں تو کہاں ہوں گا میرے جانے کے بعد آنے والے سرگرم تعریف ہوں ۔

۲۱

منشی فدا علی عیش

اللہ اکبر ایسے زمانہ میں کہ ایک عمر کی ملاقات پر دو دل

حروف لفظ دو دل کی طرح ملتے نہیں ایک دوسرے سے جُدا ہی رہتے
ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل کو محبت سے وہ چسپیدگی ہوتی
ہے جو لفظ محبت کے حروف کو باہم ان میں بھی اعلیٰ درجہ کے وہ
حضرات ہیں جو دل میں الفت کو راہ دینے کے لئے آنکھوں کے
واسطے کے پابند نہیں ہوتے جیسے آپ ہیں پھر آپ نوادر روزگار اور
مغتنمات زمانہ سے کیوں نہ ہوں یہ آپ کی قدردانی ہے کہ آپ نے
مجھے الطاف غائبانہ کا سزاوار اور میرے ہذیان کو قابل التفات سمجھا
ورنہ میں اس لائق ہوں نہ میرا کلام میں ہستی کے لئے باعث عار و ننگ
ہوں اور وہ آئینہ سخن کے واسطے زنگ لکھنؤ میں آپ کے صاحبزادہ
کی ملاقات سے بہت مسرور ہوا تھا الولد سِرٌّ لابیہ جب آپ جامع
کمالات ہوں تو اُن کا بھی محمود الصفات ہونا ضرور ہے نسخہ "سیر عشق"
کی سیر سے مجھے وہ لطف حاصل ہوا جو آپ کو اپنی سیر سے نہ ہوا ہوگا
اب خدا سے یہ التجا ہے کہ آپ کی ملاقات سے جلد ہی حصول سرور ہو اور
آپ سے یہ تمنا ہے کہ جب تک اس کا وقت آئے المکتوب نصف الملاقات
پر عمل آپ کا دستور ہو۔

”

منشی علی عمر صاحب سیکرٹری کتبخانہ

اسلامیہ بمبئی

۳۲

قدردان میرے   الطاف نامہ آیا ایزدِ فریادرس کا شکر ہے کہ میرا فغاں کس شنو آپ کے کان تک پہنچا مجھے تو یہ ڈر تھا کہ نصیب دشمناں دردِ سر بڑھ جائے گا یہ کسے امید تھی کہ ایسا نامۂ دل فغاں پسند آئے گا سچ تو یہ ہے کہ لطف آپ کی اور وہاں کے حضرات کی قدردانی ہے ورنہ وہ فغاں جو گوش شنوا کی تلاش میں ہمیشہ زمین سے آسمان تک جائے بلکہ عرش کو جنبش میں لائے اور کوئی اُسے کان لگا کر نہ سنے کب قبول کے قابل ہو اور وہ خونابہ جو دیدۂ بینا کی تمنا میں دن رات جگر سے نکل کر دامنِ صحرا تک پہونچے اس طرح کہ اُس کی روانی پہ دریا کو رشک آئے اور کوئی اُسے آنکھ اُٹھا کے نہ دیکھے کس لئے کوئی اُسکا مائل ہو انکار قدر افزائی کی نعمت کی ناسپاسی تھی اس وجہ سے آج اس کو یعنی خونابۂ جگر کو بھیجتا ہوں خدا کرے یہ بھی اپنا رنگ جمائے آپ حضرات کی خاطر دشوار پسند کے پسند آئے۔

حکیم قیام الدین نجت جونپوری

دولت آں است کہ بیخون دل آید بکنار
ورنہ باسعی عمل باغ جہاں ایں ہمہ نیست

کسی معرّف کا احسان اٹھایا کسی متوسط کا ممنون ہوا یہ کچھ نہ سہی آنکھوں ہی کو میانجی کرنا پڑا تب دو دلوں میں ارتباط کرنا پڑا تو کیا، لطف تو جب ہے کہ یہ سب بالائے طاق رہیں آنکھیں بھی کچھ نہ دیکھیں بیگانہ وار رہیں، کان نہ سُنے زبان کو موقع بولنے کا نہ ملے اور دو دل باہم آشنا ہو جائیں خدا کا شکر ہے کہ مجھے یہ دولت نصیب ہوئی آپ سے بظاہر ملے نہیں ایک دوسرے سے دور رہے اور محبت دلوں سے قریب ہوئی میرا نظم و نثر اردو اور فارسی اس قابل تو تھا نہیں کہ میں اُسے چھپواتا اپنے عیوب کو ظاہر کرکے کاغذ کا مُنہ کالا کرتا اُن کی حقیقت تو اُن کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے ایک فغانِ بےجگر دوسرا خونابۂ جگر رازداران محبت خوب جانتے ہیں کہ فغانِ نوحہ گر کو کون کان لگا کر سنتا ہے خونابۂ جگر کو کون آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ ہمیشہ ہذیان مجنوں کی طرح بے اثر ہوتا ہے اور یہ خونِ نخچیر کے مانند ہدر مگر عیب کے خریدار دوست ہی ہوتے ہیں

مولوی امیر الدین احمد صاحب نے جو اپنے سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں دونوں مجموعہ مجھ سے چھین لے اور چھپوا دیا ابتدا میں کچھ جلدیں اُن کی میں نے لے لیں اور دوستوں کو دیں افسوس ہے کہ اب میرے پاس باقی نہیں ہوتیں تو ضرور ہدیۂ خدمت کرتا آپ سے سخنداں سے دریغ رکھ کے جان سخن پر حیف روا نہ رکھتا آپ مولوی صاحب موصوف سے البتہ طلب کر سکتے ہیں پتہ اُن کا یہ ہے شہر الٰہ آباد محلہ شیخ پور مکان حضرت حکیم بادشاہ صاحب قدس سرہٗ، اگر خواہی نخواہی اُس کے دیکھنے سے تضییع اوقات منظور ہو تو منگوا لیجئے بسبقت الطاف کا جیسا اس دفعہ سپاس گزار ہوں آئندہ بھی اُس کا امیدوار ہوں۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان بہادر

مدّتے شد کہ رہِ مہر و وفا مسدود است
نہ کسے میرود آنجا نہ کسے می آید

کیوں مخدوم آپ کو کبھی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشین درویش عزلت گزین ہیچمیرز دل حزین نام میرا دُعاگوئے قدیم الٰہ آباد میں رہتا تھا کچھ اُس کی تو خبر لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا۔ یا جب وہ اپنی خبر دے تب

آپ بھی کچھ پوچھ لیں وہ نہ کچھ اس سے غرض نہیں کہ کون تھا اور کدھر گیا

این نہ بود امید واری گریہ می آید مرا

بہرحال وہ تو آپ کا ویسا ہی فدائی ہے جیسا تھا۔

امروز یقیں شد کہ نداری سرِ اہلی ۔۔۔ بیچارہ غلط داشت بھر تو گمانہا

محب

افسوس ۔۔۔ اس طلسم دُنیا میں کیا خاک کوئی دل لگائے راحت سرائے عدم سے اس شورش کدہ میں آنے کے غم کو کس طرح بھلائے جہاں نہ کسی بات کو قیام ہے نہ کسی قسم کا آرام ہے بے ثباتی کی یہ حالت کہ چشم زدن میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے بہار آتے ہی پھولوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیتی ہے کیا خوشی سے پھولتے ہو ہم خزاں کے آنے کا پیغام لاتے ہیں بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب ہنستے ہیں خوش ہوتے ہیں اور وہ اس پر روتا ہے کہ ہم تو مرنے کو یہاں آئے ہیں صبح کو نور کا تڑکا ہے تو شام کو ظلمت کا دھڑکا ہے شب کو انجم کی انجمن کا اہتمام ہے تو دن کو اس کی ترکی تمام ہے بے آرامی کی یہ کیفیت ہے کہ جس راحت کو دیکھئے اس کے پردہ میں رنج چھپا ہوا ہے غنچہ کے کھلنے کو لوگ شگفتگی جانتے ہیں اور وہ زبانِ حال

سے کہتا ہے کہ ہم اس گل گاہ میں اپنا چاک جگر دکھاتے ہیں تصویر کو
ہر ایک مکان کی آرائش اور زینت خیال کرتا ہے اور وہ خاموشی
سے یہ مضمون ادا کر رہی ہے کہ ہم اس عبرت آباد میں اپنے سر کو
دیوار سے ٹکراتے ہیں زندگی جسے سرمایۂ آسائش کہتے ہیں درحقیقت
نفس شماری ہے عالم سے ہر شخص سکون اور قرار کا طالب ہے اور
فصلوں کے تغیر سے ظاہر ہے کہ وہ خود گرفتار بیقراری ہے ہنسی
کی کثرت میں آنکھوں سے آنسو کا ٹپک پڑنا اس کی دلیل ہے
کہ شادی میں غم شامل ہے محاسب عقل بر سر حساب آئے تو ثابت
ہے کہ یہاں رنج مسرت سے فاضل ہے بہت سچ کہا ہے ؎

جہاں میں عرصۂ شادی سے سوا دہ چند ہی غم کا
کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

کمال افسوس اس کا ہے کہ جو زمانے کے لئے باعث فخر و ناز ہوتے
ہیں زمانہ انہیں سے دغا کرتا ہے جن سے اسے زیب و زینت
ہوتی ہے وہ انہیں کو خاک میں ملاتا ہے دور کیوں جائیے ابھی کل
کی بات ہے کہ آپ کے بھائی بزم جہاں کے چراغ تھے آج دل
احباب میں داغ ہیں کل لوگ ان کے ذکر سے خوش ہوتے تھے آج
ان کی یاد میں روتے ہیں ایسے بھائی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ

جائیں یہ صدمہ آپ کے لئے کچھ کم نہیں مگر صبر کے سوا اور چارۂ الم نہیں خدا اُنہیں جنت میں جگہ دے آپ کو توفیق صبر عطا کرے یہ مصیبت آپ کے لئے مقطع مصائب و آلام ہو آئندہ جو پیش آئے وہ مطلع انبساط و آرام ہو۔

محب

یاس و غم و آرزو جمع یہ سب چیز ہے
بل بے سمائی تری دل بھی عجب چیز ہے

جب حکیم علی الاطلاق نے رنج کو مشکل اور عجز کو مجسّم کرکے اُس ہیکل کا نام انسان رکھا جیسا خود فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد اور پھر اسکو اشرف المخلوقات کے خطاب سے مخاطب کیا تو اس نے اپنی حکمت بالغہ سے ایک مضغۂ صنوبری دل نام اس حوصلہ کا بنا کے اُس کے سینہ میں رکھ دیا جس میں دونوں جہان کی آرزو اور تمنا امید اور یاس غم اور الم رنج اور محن اندوہ اور ملال سب کی گنجائش بدرجۂ کمال ہو اور اُس کو اس صنعت سے بنایا کہ نزاکت میں تو شیشے سے زیادہ سختی برداشت کرنے میں پتھر ہو جانے کو آمادہ اُس کے تو علم میں تھا کہ اس کو جو سب سے اشرف

واعلیٰ ہونے کا مرتبہ دیا گیا ہے تو اسی کو اعظم مصائب اور بلیّات کا مورد
بھی ہونا ہوگا اگر اس کو ایسی چیز نہ دی جائے گی تو اُن مصیبتوں کا تحمل کیونکر
کرے گا اور بعد اس کے اُس کو ولقد کرمنا بنی آدم کا خلعتِ خاص عطا
کرکے عالمِ امکان میں بھیجا تو علاوہ اور مصیبتوں کے ایک نہایت سخت
مصیبت مفارقت کی اُس پر نازل کی یعنی جسے جی چاہے اُس کی جدائی
الحفیظ الامان جن پر پڑتی ہے وُہی اس کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں یہ
ایسی بلا ہے جس سے بے نشتر چبھائے کلیجہ خون ہو کر بہہ جاتا ہے بے
آگ لگائے سینہ آتش کدہ بن جاتا ہے اسی سے آنکھیں دریائے
اشک کے طوفان میں امید کی کشتی کو ڈباتی ہیں اسی سے آتشین آہیں خرمنِ
تمنا پر یاس کی بجلی گراتی ہیں اسی سے جوشِ حیرت میں انسان مبہوت
ہو جاتا ہے کہ اپنے حال پر ہنسی نہیں آتی اسی سے از خود رفتہ ہو کر آدمی
کو ایسی چپکی لگ جاتی ہے کہ اپنی حالت بھی کہی نہیں جاتی اسی سے نیند
اور آنکھ اور سر اور بالیں میں عداوت ہوتی ہے اسی سے قرار اور طبیعت
تسکین اور مزاج میں مغایرت ہوتی ہے اسی سے بن آئے مر جاتے ہیں
اگرچہ موت کا ایک دن مقرر ہے اسی سے قسمت پلٹ جاتی ہے ہر چند
وہ بات بدلتی نہیں جو مقرر ہے اسی کی جادوگری ہے کہ زمین پر پڑے ہوئے
خاک اُڑاتے ہیں اور دل ڈوبا جاتا ہے اسی کی نیرنگ سازی ہے کہ آد

ثمر افشاں سے سرو چراغاں بنے رہتے ہیں اور چراغ حیات بجھا جاتا ہے
اسی کے کرشمے ہیں کہ ضعف سے خود تو اٹھا نہیں جاتا مگر شورِ فغاں سے قیامت
سر پر اٹھاتے ہیں نقاہت سے تنکا تو ہلایا نہیں جاتا لیکن آہِ رسا سے عرش
کی زنجیر ہلاتے ہیں اسی سے نازپروردوں کے مصیبت میں بادیہ پیمائی
ہوتی ہے اسی سے پاؤں کے آبلوں کو صحرا کے کانٹوں تک رسائی ہوتی ہے
اسی سے راحت کی امید پر آنکھیں بند کیجیے تو وہ خواب میں نظر نہیں آتی
اسی سے آسائش کی آرزو میں پلک نہ جھپکائیے تو بیداری میں وہ صورت
نہیں دکھاتی سخت جانی سے اپنے کو پتھر بنائے تو یہ اُسے شیشہ بنا کر
توڑتی ہے خاکساری سے اپنے کو خاک میں ملائے تو یہ نقشِ قدم
بنا کر پامال کر کے چھوڑتی ہے اسی سے دم سینہ ایسا گھبراتا ہے جیسے قیدی
قید خانہ میں گھبرائے اسی سے کلیجہ اُمنڈ کر اس طرح منھ کو آتا ہے جس طرح
جان لبوں پر آئے اسی سے انسان بغیر گلے پر چھری پھیرے مرغ نسبل
کی طرح تڑپتا ہے فرق اتنا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو کر ٹھہر جاتا ہے اور یہ مر کر
بھی تڑپتا ہی رہتا ہے اسی سے آدمی جرس کے مانند فغاں کیا کرتا ہے
تفاوت اس قدر ہے کہ وہ منزل پر پہونچ کر چپ ہو جاتا ہے اور یہ
منزل گور میں بھی چلاتا ہی رہتا ہے اسی کے مارا ہوا نے کے مثال نالے
کیا کرتا ہے مگر اس کو سب سنتے ہیں اس کو کوئی سنتا نہیں اسی کا گرایا

ہوا دیوارِ کہنہ کی صورت خاک پر گرا رہتا ہے لیکن اُسے لوگ پھر اُٹھاتے ہیں اور یہ کسی کے اُٹھائے اُٹھتا نہیں اسی کے مبتلا کو زہر کی اُتنی ہی تلاش ہوتی ہے جتنی سکندر کو آبِ حیات کی تھی اسی کے گرفتار کو موت کو اُتنی ہی جستجو ہوتی ہے جتنی مجنوں کو لیلےٰ کی ملاقات کی تھی اسی کے لاغر بیمار کو تارِ بستر سے جدا کرنا ملک الموت سے بھی ہو نہیں سکتا اسی کے شب بیدار کو خوابِ مرگ بھی چاہے کہ دم بھر سُلائے تو وہ سو نہیں سکتا انسان اتنی مصیبتیں اُٹھا کر جو زندگی کا دم بھرتا ہے اپنے کو زندوں میں شمار کرتا ہے تو حضرتِ دل ہی کے بدولت اگر اُسے حوصلہ صبر و شکیبائی کا نہ ہوتا اُس کا ظرف اس سمائی کا نہ ہوتا تو یہ یہ خاک کا پُتلا یہ پانی کا بلبلہ اتنی آفتیں جھیل سکتا۔ ایسی جانبازی کا کھیل کھیل سکتا میں بھی جو تمہاری مفارقت میں اب تک جان نہ ہونے پر زندہ کہلاتا ہوں جینے کے غم کو موت کی امید سے تسکین دے کر بہلاتا ہوں تو اُنہیں کی ہمت سے ورنہ ماہیِ بے آب سے چکورِ مہتاب سے پروانہ چراغ سے بُلبل باغ سے دور رہ کر جئے تو جئے میں تم سے جُدا رہ کر ہرگز جی نہیں سکتا میرا تمہاری جدائی میں جینا ایسا محال ہے جیسا بے قضا آئے کسی کا مرنا اتنے دنوں جس طرح گزرے وہ گزرے آخر کہاں تک ہر امر کی ایک غایت ہر بات کی ایک نہایت ہوتی ہے۔ بس اب مجھے

اس عذاب سے چھڑاؤ اس جور و ستم سے باز آؤ نہیں تو ایک دن وہ دن آئے گا کہ لوگ تم سے آکر کہیں گے۔

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

شیخ رفعت علی

صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ من زیبِ دستارے نہ شد

الہ آباد کا دربار ہو لیا لکھنؤ کا دربار ختم ہوا۔ کوئی آتا تو کیا یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ مولوی شیخ عبدالحق صاحب خیرآبادی نے کس دربار میں شمس العلما کے خطاب کی سند حاصل کی شیخ رفعت علی صاحب نے کہاں کہاں کی سیر دیکھی کس کس سے ملے کسی نے بھی نہ لکھا کہ تم سے ملنے کا وعدہ وفا نہ کرنے کا یہ سبب ہوا۔ وفورِ اشتیاقِ ملاقات پر تو یہ حال ہے کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا یہاں قبلِ دربار کے تو دن گن گن کے کاٹے دربار کے بعد سے تردد میں تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ؎

من بیوفا نیم بوفای خورم قسم   من چوں شما نیم بشما میخورم قسم

غلام علی خاں

رسائی کان تک تیرے ہوئی حاصل نصیبوں سے
نہ کیوں کر رشک گمنامی سے میری ہووے شہرت کو

باوجود محرومیِ ملاقات ظاہری سے آپ کی غائبانہ محبت نے نہ صرف آپ کے وسعتِ اخلاق ہی کا ممنون کیا بلکہ آپ کی قدردانی نے حضیضِ ہیچمیرزی سے اوجِ شہرت پر پہونچا دیا میں نے کبھی اپنے کو انشا پردازوں میں اور شاعروں میں شمار نہیں کیا اس سبب سے اگر کبھی بے اختیاری دل سے کوئی نالہ پیرایۂ نثر میں یا کوئی فغاں سلسلہ نظم میں لب تک آیا اور غمازی خامہ نے اُسے گوشِ صفحہ تک پہونچایا تو وہ ترتیب اور تدوین سے ناکام رہا۔ میرے ایک عنایت فرما نے جو اس شہر کے مشاہیر رؤسا سے ہیں اور مجھ پر مجھ سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں اُن اوراقِ پریشاں کو شیرازۂ بند جمعیت کر کے زینت اشاعت مزین کرنے کی غرض سے چھپوا دیا ہے میرے پاس اُس کی جلدیں نہیں ہیں اُنہیں کے پاس ہیں اُن کا نام نامی مولوی امیر الدین احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ اور نشان سکونت شہر الہ آباد محلہ یحیی پور ہے اُن سے آپ طلب فرمائیں تو وہ بے تامل

بھیجدیں گے میں نے اُن کو لکھدیا ہے خود اس خدمت کے سرانجام نہ دینے سے نادم اور خجل ہوں۔ والسّلام

استفسار

قاضی علی احمد صاحب بدایونی

مکرمی آپ جو تحریر فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت امیر خسرو کے اس شعر پر ؎

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

یہ اعتراض کیا کہ جب جان ہی تن سے نکل گئی تو معشوق اُس میں کیونکر رہا اور آپ نے اُس میں یہ تاویل کی کہ جان مجازی کے جانے کے بعد جان حقیقی باقی رہتی ہے اس تفریق اور تقسیم جان کو جو آپ فرماتے ہیں خارج از مبحث رکھ کر پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ اعتراض کیا ہے

ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی ناواقفی پر دلالت کرتا ہے ظاہراً وہ
یہ سمجھتے ہیں کہ جان جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد معدوم اور فنا ہو جاتی
ہے اس وجہ سے اس میں کسی کیفیت کا باقی رہنا محال جانتے ہیں حالانکہ
یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کچھ حضرات صوفیہ ہی پر موقوف نہیں شارحین اور
متکلمین متصوفین جمہور کو اس پر اتفاق ہے کہ جان تن سے نکلنے کے بعد
باقی رہتی ہے اور جب یہ مسئلہ مسلمہ ٹھہرا تو پھر اس میں کسی کیفیت کا باقی
رہنا کیوں غیر ممکن خیال کیا جاتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ صراحی سے شربت
نکل گیا مگر پانی میں قند کی شیرینی باقی ہے یا شیشہ سے گلاب اونڈل پڑا
مگر گلاب میں بو باقی ہے تو مستبعد نہ سمجھا جائے اور یہ کہنا کہ جان تن سے
علیحدہ ہوئی اور جان میں تعلق محبوب باقی ہے بعید از قیاس کہا جائے
تو حیف کی بات ہے جو لوگ اسرار محبت سے واقف نہیں ہیں یہ
خیال کرتے ہیں کہ محبت بھی مثل اور امراض کے ایک مرض ہے کہ اسکا
قیام اسی وقت تک ہو سکتا ہے جب تک جان تن میں ہو مگر جو راز محبت
کو جانتے ہیں وہ اس کو مانتے ہیں کہ محبت صادق کا تعلق جان ہی کے
ساتھ ہوتا ہے۔ اور گو جان تن سے جدا ہو وہ تعلق ہرگز جان سے جدا
نہیں ہوتا۔ حضرت امیر بھی یہی فرماتے ہیں کہ جان کو تم نے جسم سے
علیحدہ کیا لیکن تم جان سے علیحدہ نہ ہوئے یعنی تمہاری محبت کا تعلق

باقی رہا غنیمت سمجھئے کہ معترض نے یہ اعتراض نہ کیا کہ معشوق اس ڈیل ڈول پر جان کے اندر کیسے سما گیا جو کہتے ہیں در جانی ہنوز ایسے اعتراض اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اُسے سُن کر جواب دینے میں اوقات ضائع کرے یہ آپ کی خاطر تھی کہ اتنی خامہ فرسائی کی اور پھر وہ بھی رمضان شریف میں۔

سیّد محمد محسن خاں بہادر ذوی القدر

مکرمی حضرت حافظ کے اس شعر میں ؎

ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقان بپوشانی
کہ سودائے جہاں داری غمِ لشکر نمی ارزد

معشوق کو بادشاہ سے اور مشتاقوں کو لشکر سے تشبیہہ دی ہے وجہہ تشبیہہ پہلے میں مرجعیت اور فرماں روائی اور دوسرے میں کثرت اور فرماں برداری ہے اور حرف رابطہ دونوں مصرعوں کا کاف علت جو دوسرے مصرع کے شروع میں ہے مگر یہ دونو باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ قابل استفسار نہیں یا میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھا اگر ایسا ہو تو پھر تفصیل سے لکھئے اس شعر میں لفظ سودا غلط لکھا گیا ہے صحیح یوں

ہے کہ "شادی جہاں داری غم لشکر نمی ارزد" لفظ غم بھی یہی چاہتا ہے کہ سودا کی جگہ شادی ہو اور اس کو دو طرح سے پڑھ سکتے ہیں بپوشانی یعنی تم مشاقوں کی طرف توجہ نہ کرو شادی جہاں داری اس قابل نہیں ہے کہ اُس کے لئے غم لشکر اوٹھایا جائے یہ تخویف اس لئے کہ وہ لوگوں کو منھ نہ دکھائے اور رقیبوں کی کثرت نہ ہو جائے۔ بپوشانی یعنی تم مشاقوں سے پردہ نہ کرو جہاں داری کے شادی کے مقابلہ میں غم لشکر کوئی چیز اور اُس کی کچھ حقیقت نہیں یہ ترغیب اس واسطے کہ وہ جلوہ گر رہے اور دیدار نصیب ہوا کرے اس کا علم خدا کو ہے کہ شاعر کا مطلب کیا تھا۔

تقریظ

انشائے بہار بیخزاں از مولانا غلام امام شہید

مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! صفحۂ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! تار نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں۔ واہ واہ! کلک گہر بار کی کیا درفشانی ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشا ہے؟ جس کے دیکھنے سے یہ لطف اُٹھتا ہے۔ کتاب ہے؟

یا گلزار بیجزاں۔ جس صفحہ کو دیکھئے۔ حاشیۂ فردوس کے روشوں پر حاشیہ لکھا ہے۔ جدول کے خطوں پر سلسبیل اور کوثر کا جی پانی پانی ہوتا ہے۔ سطریں سنبلستان ہیں۔ الفاظ گلستان ہیں۔ حرف کی کشتوں پر سرو اور شمشاد کا یقین ہوتا ہے۔ دائروں سے نرگستان آنکھوں کے تلے پھر جاتا ہے۔ حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے۔ گویا درختوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے۔ کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے۔ جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے۔ وہاں قوت نامیہ سے درخت ہر سال پھولتے پھلتے ہیں۔ یہاں فکر و ادراک سے جب دیکھئے فقرات برجستہ سے معانی تازہ نکلتے ہیں۔ مجموعہ ہے۔ یا گنج شائگاں۔ ہر باب میں ایسے ایسے بے بہا جواہر حکمت کے بھرے ہیں کہ جسے دیکھ کے جوہری عقل کی عقل چکراتی ہے۔ ہر فصل میں اتنے نقد کامل عیار دانش کے انبار دھرے ہیں۔ کہ مقدار اُس کی صیرفی ذہن میں نہیں آتی۔ یہ وہ جوہر ہے۔ جس کے رکھنے کو حلقہ چشم درج ہو تو بجا ہے۔ اور یہ وہ نقد ہے۔ جس کے پرکھنے کو سویدائے دل محک ہو تو زیبا ہے۔ شہر علم کے مفلسوں کو صلائے عام ہے۔ کہ اس کی سیر کو آنکھیں کھولیں۔ دامن نگاہ میں موتی رولیں۔ دیار دانش کے ناداروں کو اجازت تام ہے۔ کہ اس گنجینہ کے دیکھنے کو آئیں۔ جتنا حوصلہ ہو۔

اُٹھائیں۔ خالی ہاتھ نہ جائیں۔ کتاب ایسی کیوں نہ ہو۔ جب مصنف
اس کا وہ ہے۔ جس کی فصاحت نے سحبان کے مُنہ میں قبر کی مٹی
سے خاک بھری۔ اور جس کی جادو بیانی نے سحرِ بابل کی قدر مٹی کی
یعنی فاضل بے بدل۔ عالم عدیم المثل منشی اعجاز نگار۔ شاعر سحر گفتار۔ مولینا
غلام امام شہید جن کا ثانی فضل و کمال میں نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ تحریرِ عربی
سے اُنکی اعشیٰ اور جریر کی پیٹھ قبر میں نہ لگی تھی۔ نثر فارسی سے ظہوری اور طغرا
خواب عدم میں چین سے نہ سوئے تھے۔ شعر نے انوری کو بے نور خاقانی
کو ٹکڑ گدا کر دیا تھا۔ اب اُن کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا۔ میر
اپنا مرنا غنیمت جانے گا۔ ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی۔ جو یہ تخلص اختیار
کیا یعنی در پردہ معذرت چاہی۔ کہ میں تو ہوس کرتا ہوں۔ کمال حق اور کسی کا
ہے۔ سوز کو بھی کچھ اُن کی خبر پہونچ گئی تھی۔ کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص
اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور
کرتا۔ آتش نہ مرتا۔ تو کیسا کیسا جلتا؟ اُن کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھو دیا۔
اُستادوں کا سفینہ دریا میں ڈبو دیا۔ سچ تو یوں ہے۔ کہ اُنکی حیثیت
اور اُردو نویسی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس پر بھی اگر تفنن طبیعت کے
لئے ادھر کچھ میل کرتے۔ تو ایسی لکھتے۔ کہ اُن کی اُردو انشا کے سامنے
علامی اپنی انشا سے خط غلامی لکھتا۔ بہار دانش کی بہار پر خزاں کا وقت

آجاتا۔ سہ نثر ظہوری کو لوگ چھپا ڈالتے۔ طغرا کی تحریر کو خط باطل کی طرح مٹا ڈالتے پر اس سے مجبور ہوئے کہ فرمائش نثر عاری کی تھی۔ گو انھیں اس سے عار تھا۔ پر حکم ماننا ناچار تھا۔ لیکن لوٹ جانے کی جا ہے۔ کہ اس سادگی میں سیکڑوں طرح داری کا مزا بھرا ہے۔ اپنے نزدیک تو کچھ نہ لکھا ہو۔ پر کیا کچھ لکھا ہے۔ اگر انصاف کیجئے۔ تو ایسی کتاب اردو میں آج تک کوئی نہیں ہوئی۔ اردو کو رتبہ فارسی کا بخشا ہے۔ اردو نویسوں کو سامان انشا پردازی کا عطا کیا ہے۔ اس کی بدولت ہر ایک اردو نویس اب ایسا منشی یکتا ہے کہ فارسی اُستادوں کو اُن کے آگے سکتا ہے۔ ان میں سے کب کوئی ویسا لکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اردو نویسوں ہی کے حق میں مفید مطلب نہیں ہے ہر ایک قاعدہ اس کا فارسی والوں کے حق میں بھی اکسیر کا نسخہ ہے۔ مصنف نے جو اس کتاب کی تصنیف عاجز کی تکلیف دینے سے اختیار فرمائی۔ میری بان میں کیا تاب و تواں ہے کہ اس کا شکر ادا کروں۔ یہ تقریظ تو کیا اگر دفتر لکھوں ایک حرف ادا نہ ہو۔ اس لئے دعا پہ ختم کرتا ہوں۔ الٰہی!۔ جب تک معنی سخن میں۔ اور سخن حرف میں۔ حرف خط میں۔ اور خط جان قالب کتاب میں ہو۔ دانشمندوں کا تعویذ جان اس کتاب کا ہر ایک باب ہو۔ یہ دعا پیغمبر کی مستجاب ہو۔

نواب عبدالعزیز خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر چند یہ دنیا جسے ہم طلسم حیرت کہتے ہیں خود ایسی ہمیدار ہے کہ نقش
بر آب اس سے زیادہ استوار ہے کسی عبارت سے اس کی بے ثباتی
بیان ہو سکے دشوار ہے کسی لفظ سے اس کی تعبیر ہو دور از کار ہے جس وقت
ہم اس کی بے بقائی لکھنے کو قلم اٹھاتے ہیں جب تک خامہ ہاتھ سے صفحہ
تک پہونچے وہ وقت خود باقی نہیں رہتا پھر لکھا جائے تو کیونکر لکھا جائے
جس دم ہم اس کا فانی ہونا بیان کیا چاہتے ہیں اتنے میں کہ بات دل سے
زبان تک وہ گھڑی آپ ہی فنا ہو جاتی ہے کچھ کہا جائے تو کیا کہا جائے
جس تماشے کو ہم دیکھ رہے ہیں پلک جھپکی اور وہ بدل گیا جس ہنگامہ کی سیر
سے ابھی ہم سیر نہیں ہوئے ہیں نظر پھری اور کچھ کا کچھ ہو گیا جو کارخانہ
خود ایسا ناپایدار ہو وہاں کون سی شے کسی کی یادگار ہو مگر اس پر بھی
اگر کوئی چیز گذشتوں کی یاد دلانے والی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے
ہیں ان کو دھیان میں لانے والی ہے تو سخن ہے یہی آتش کارواں
ہے یہی نقش قدم رفتگاں ہے اسی سے ہیں کچھ ان کا پتہ لگتا ہے جو کل

مالکِ جاہ و املاک تھے اور آج زیرِ خاک ہیں اسی سے ہمیں کچھ اُن کا سُراغ ملتا ہے جو کل موجبِ زینتِ انجمن تھے اور آج باعثِ ماتم و محن ہیں اسی سے گذرے ہوؤں کا حال ہم پر ایسا واضح ہوتا ہے کہ گویا وہ کہہ رہے ہیں اور ہم اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں اسی سے آنے والوں کو ہماری کیفیت ایسی روشن ہو گی کہ جیسے ہم اُن کے سامنے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں چنانچہ یہ دیوان جس کا ہر مصرعہ چمنستانِ فصاحت کا سروِ چمان ہے جس کی ہر بیت کشورِ بلاغت کا قصر فلک نشان ہے بلکہ ہر لفظ معانیٔ نادرہ کی ایک کتاب ہے ہر حرف مضامینِ نایاب کا باب ہے ہر ورق ایک قلزم ہے جس میں غواصِ فکر کو درِ ثمین ملتے ہیں ہر صفحہ ایک معدن ہے جس سے طرح طرح کے جواہر رنگین نکلتے ہیں اُن کا یادگار ہے جو سلف کے یادگار اور خلف کے افتخار تھے یعنی جامع علوم ماہر فنون انسانِ کامل عزیزِ ہر دل نواب عبدالعزیز خاں مغفور اللہ اکبر کیسی استعدادِ خداداد ذہنِ رسا فکرِ بجا تھی۔ جس کا ادنیٰ نتیجہ یہ دیوان ہے۔ اُن کے تبحرِ علمی کے اعتبار سے جو اُنکی اور تصانیف سے ثابت ہے شاعری اُن کے لئے دون مرتبہ تھی اور ادھر کمتر توجہ فرماتے تھے اس پر یہ جو کچھ کہا ہے ایسا کہا ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا اسے دیکھ کے سخن شناسوں کو حیرت ہے کہ جن مضامین

تک خاقانی اور انوری کے دست فکر نہ پہونچے وہ اُن کے ہاتھ کہاں
سے آئے اور پھر اس کثرت سے معنی فہموں کو عبرت ہے کہ جن مطالب
کی تلاش میں فصحائے عرب و عجم نے جان دی اور ناکام رہے وہ انہیں
اس قدر کیوں کر ملے اور پھر اس ندرت سے اللہ اللہ کل کی بات ہے
کہ وہ منتخب روزگار بزم احباب میں باعث افتخار علم و فضل میں لوگوں
کے مقتدا ہنر اور کمال میں ہر فن کے پیشواؤں کے پیشوا خلق ۔ حلم ۔ ہمت
مروت ۔ محبت ۔ فتوت ۔ استقلال ۔ استقامت ۔ پاس ۔ وضع ۔
حفظ مراتب میں مشہور عالم ۔ ذہن ۔ ذکاوت ۔ حافظہ ۔ عقل ۔ فہم ۔ دوراندیشی
پیش بینی ۔ معاملہ فہمی میں محسود بنی آدم تھے ۔ آج آفتاب زیر زمین اور
بہشت میں حوروں کے ہمنشیں ہیں وہ تو یہاں بھی اچھے تھے اور
وہاں بھی اچھے ہیں افسوس اور رونا تو ہمیں اپنے حال پر ہے کہ وہ
دولت ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی اگر لاکھوں برس آسمان چکر کھائے
تو اس کا ملنا ممکن نہیں بس بہتر اس بیان سے زیادہ دل نہ دکھاؤ
کبھی اس یادگار کو اپنے زخم جگر کا پھاہا بناؤ اور کبھی اس شعر کو عمل میں لاؤ۔

سیر کرتے دو گھڑی جی اس میں بہلا لیتے ہیں
دل ہمارا ہے مرقع صحبت احباب کا

دیوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راستی ایک ایسی چیز ہے کہ اُس کا خالق بھی (جس کے
حمد سے ہماری زبان الکن ہمارا بیان بے سروپا ہماری تقریر ناقص
ہمارا کلام نارسا ہے) اُس کو پسند کرتا ہی یہ ایک ایسی صفت ہے
کہ ممدوحِ خدا بھی جس کے نعت سے ہمارا نطق ابکم ہمارا ذہن عاجز
ہماری عقل حیران ہمارا فہم قاصر ہے اُس کی مدح فرماتا ہے۔ زبان
اور قلم کو خالقِ اشیا نے وقت خلقت ہی ہیئت میں راست اسلئے
بنایا کہ سخن میں اپنی ہیکل کے موافق راستی اختیار کریں کجی کو عیب
جانیں۔ پھر اگر کوئی اُسے اپنا شعار کرے تو منصف مزاجوں کو چاہیے
کہ اُس کی راست گوئی کی داد دیں نہ یہ کہ اُسے مبالغہ سمجھیں کیا
کوئی خورشید کو روشن بہار کو مشاطۂ شاہدِ چمن۔ آسمان کو بلند صاحب
درہم و دینار کو دولت مند۔ زمین کو بسیط سمندر کو محیط مشک کو معطر
شمع کو منور پھول کو نازنین قند کو شیریں گوہر کو آبدار جوہر کو تابدار آئینہ
کو مجلّے مصقّل کو مصفّا کہے تو کوئی اُسے مبالغہ جانے گا نہیں ہرگز

نہیں سب کہیں گے امر حق کا اظہار کرتا ہے جب یہ مسئلہ مسلّم ٹھہرا تو پھر
جس کو خداوند کریم نے مالکِ ملکِ سخن بنایا ہو اگر ہم اُس کو یہ کہیں
کہ شاعری میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں تو کیا جھوٹ ہے جب دوسرا
ایسا پیدا ہی نہ ہوا ہو تو یکتا نہ ہو کیا ہو اگر ہم اُنہیں یہ سمجھیں کہ سخن سنجی میں
خود ہی اپنے عدیل ہیں تو کیوں کر سچ نہیں ہے جب اور کوئی ایسا وجود
ہی میں نہ آیا ہو تو پھر ہمتا نہ ٹھہرے کیا ٹھہرے اُن کے کلام میں فصاحت
کی کثرت پر نظر کریں تو بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفت جتنی پیدا ہوئی
ہے سب انھیں کو دے دی گئی بلاغت کی افراط جب خیال میں
لائیں تو بلا شک یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ یہ نعمت جس قدر خلق کی گئی
تمام انہیں کے حوالہ ہو گئی اس قول کو کس وجہ سے یہ خیال کیا جائے
کہ ہیچمیز مبالغہ کرتا ہے یا اپنے اتحاد اور ارتباط قدیمی کی پاسداری نباہتا
ہے یہی کیوں نہ سمجھا جائے کہ پہلے سرے کا راست گو ہے کیسی سچّی
بات کہتا ہے خصوصاً جب اس صداقت بیان پر اُس کے ایک شاہد
عادل اور گواہ صادق موجود ہو وہ کون اُس کا دیوان جو اب تک
خلوت خانۂ خفا میں تھا اور اب بمصداق ؎

نکو رُد تاب مستوری ندارد
چو در بندی سر از روزن برآرد

بزم اظہار میں آیا ہے یعنی چھپ گیا ہے۔ اب تک مشکل یہ تھی کہ ایسے شاہد زیبا کا نظارہ حاصل ہونا آسان نہ تھا اور اب تو اس نے اپنے جمالِ جہاں آرا سے نقاب اٹھا دیا ہے شہرت کا غازہ چہرہ پر ملا ہے دیدار کے طالبوں کو صلائے عام ہے کہ آویں اس کی نور آگیں صورت سے آنکھیں روشن کریں اور دیکھیں کہ کیا ہے جو اس میں نہیں ہے زبان ایسی کہ سلاست اس پر فدا بیان ایسا کہ حسن اس پر شیدا، مضامین ایسے بلند کہ عرش سے نیچے ان کا مقام نہیں۔ الفاظ ایسے دل پسند کہ معشوقوں کی طرح ان کے دلربا ہونے میں کچھ کلام نہیں ترکیبوں میں چستی بندشوں میں درستی مضامین میں جدت استعاروں میں ندرت ہر بات میں ایک نئی بات ہر نکتہ میں کچھ اور ہی گھات تب تو میرے کہنے کا یقین آئے گا غور سے دیکھو تو یہاں شاہد سخن کا جلوہ ہی کچھ اور ہے اس نازنین کے اداؤں کا کچھ اور ہی طور ہے ؎

دلربا جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

کرشمہ ہے تو دلربا غمزہ ہے تو روح فرسا عشوہ ہے تو جگر دوز شوخی ہے تو فتنہ آموز ادا ہے تو قیامت زا انداز ہے تو حسرت افزا تبسم ہے تو نمکین تکلم ہے تو شیریں نگاہ ہے تو تیر اشارہ ہے تو شمشیر صفحوں کی سفیدی نہیں

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے جس کے سیر سے جی ہی سیری نہیں آتی حروف کی سیاہی نہیں سرمۂ تسخیر ہے کہ جہاں نگاہ پڑی پھر وہاں سے اٹھائی نہیں جاتی ہر شعر کو جی چاہتا ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھا کیجیے ہر مصرعہ ایسا دل میں گڑ جاتا ہے کہ بس اسی کو وردِ صبح و مسا کیجیے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میری یہ دعا ہے کہ خدا سخن فہموں کو اس کے قدر کی دولت عطا کرے اور حاسدوں کے چشم بد سے اسے بچائے۔ فقط

ایک خط

منشی ممتاز علی خاں

۱۳۰۱

جناب - مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالہ کیا ہے غازی الدین حسین خاں صاحب کے پاس بھیجدیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں مصنف آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے تب چھپوانا شروع کیجیے تو بہتر ہے فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذات خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے تھے لکھوا دئے ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گورکھپور - لکھنؤ - کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں اور

ان سب کو بھی مجموعہ میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے
اس کی تصحیح کرلی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں پر رکھا نہ رہے
اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہو
جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ
اور لکھوالے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے ان کو دے دیگا۔

تمام شد

عکس تحریر حضرت بیخبر

عزیز گرامی منشی میرزا قمر الدین صاحب زاد اللہ قدرکم

میں نے ہرچند قصد کیا کہ [illegible] ان اخباروں

اور ضمیموں کو دیکھوں جنہیں حضرت سیدنا امیر ابو العلا رضی عنہ

قدس سرہ کی درگاہ عالم پناہ واقع اکبرآباد کی نسبت مضامین اور

مباحثے چھپے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اتنی فرصت

نہ ملی اور یہاں مجبور رہا —

راقم

فقیر غلام غوث سررشتہ دار میر منشی محکمہ عالیہ

گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی واودھ

ملقب بہ خواجہ و مخاطب بہ خطاب خان بہادر

ذو القدر از سرکار دولتمدار انگلشیہ ۲۷ جون

۱۸۹۵ء مقام الہ آباد

اصل خط ملک [illegible] والد مرزا سعید الدین احمد

بجناب [illegible] درگاہ میر ابو العلا اکبرآبادی

دیگر تصانیف مرتبہ انشاء بیخبر

شاہان مغلیہ اور تاریخ آگرہ

ملکہ ممتاز محل و شاہجہاں

ملکہ نور جہاں بیگم

نواب زیب النساء بیگم

تاریخ اجمیر و خواجہ غریب نواز

تذکرہ مہر

حیات نظیر

مردم دیدہ

نغمائے ہند

وقائع ادب

اصول نثر اردو

میلاد شہید مظلوم

کتابوں کے ملنے کا پتہ
ناگیندر ناتھ شرما
منیجر کورونیشن پریس سہٹاگلی آگرہ